اطفالِ پاکستان نمبر

آنکھ مچولی

مارچ ۱۹۹۷ء

تیاری سے تواضع تک ـــ مزا ہی مزا !
AHMED
CUSTARD
POWDER
AHMED
KHEER MIX
(RICE PUDDING MIX)
AHMED
Creme Caramel
احمد
AHMED
STRAWBERRY
JELLY
CRYSTALS
خوب کھائیں - روز لائیں !
قدرت نے ذائقہ دیا احمد نے محفوظ کیا
MASS '96

معیار
ہر قیمت پر
بہ لحاظ معیار، اپنی قیمت کا صحیح نعم البدل
رُوح افزا
گرمی کی حدت اور پیاس کی شدت سے محفوظ رہنے کے لیے مشروبات کا استعمال ہر گھر کی ضرورت ہے۔ اشیائے صرف کی روز بروز بڑھتی ہوئی قیمتوں کے پیشِ نظر سلیقہ شعاری کا تقاضا ہے کہ آپ اہلِ خانہ کے استعمال اور مہمانوں کی تواضع کے لیے ایسے مشروب کا انتخاب کریں جو اپنے ذائقے، خوشبو اور تاثیر کے لحاظ سے سب کا پسندیدہ بھی ہو اور گھر کے اخراجات کو متوازن رکھنے میں معاون بھی۔ رُوح افزا اپنے اعلا معیار، فرحت د
تازگی بخش خواص اور پسندیدگی کے اعتبار سے نہ صرف آپ کے انتخاب پر پورا اترتا ہے بلکہ مقابلتاً باکفایت بھی ہے۔
رُوح افزا کا ایک ٹھنڈا، میٹھا، مزیدار گلاس صرف تین رُپے میں تیار ہوتا ہے جبکہ دوسرے کولڈ ڈرنکس کے اسی ایک گلاس پر ڈھائی سے تین گنا زیادہ لاگت آتی ہے۔ آزما کر دیکھ لیجیے۔
رنگ، خوشبو، ذائقے، تاثیر اور معیار میں بے مثال
راحتِ جاں رُوح افزا مشروبِ مشرق
ہمدرد
مدینۃ الحکمۃ تعلیم سائنس اور ثقافت کا عالمی منصوبہ
Adarts-HRA 14/96

حبیب بینک کریڈٹ کارڈ اب ایک نئے انداز میں

ہم انتہائی مسرت کے ساتھ آپ کو نئے اور بہتر کریڈٹ کارڈ سے متعارف کرا رہے ہیں۔

حبیب بینک ملک کا پہلا بینک ہے جس نے ۱۹۶۶ء میں پاکستان میں کریڈٹ کارڈ اسکیم کو متعارف کرایا۔ اور صرف چند ہی سالوں میں یہ اسکیم بے حد مقبول ہوگئی۔ آج حبیب بینک کریڈٹ کارڈ رکھنے والوں کی تعداد ہزاروں میں ہے اور پورے ملک میں ۱۰۰۰ سے زائد ادارے جس میں ایئر لائن، پٹرول پمپ، ہوٹل، ریسٹورنٹ، ہسپتال، ڈیپارٹمنٹل اسٹورز، جنرل مرچنٹس وغیرہ شامل ہیں اسے قبول کرتے ہیں۔

ہمارے کریڈٹ کارڈ رکھنے والے اسے آزادانہ استعمال کرنے کے مجاز ہیں۔ سفر ہو یا خریداری آپ صرف بل پر دستخط کریں۔ باقی کام ہماری ذمہ داری ہے۔

نقد رقوم رکھنا غیر محفوظ ہے، اپنا کریڈٹ کارڈ ہمیشہ اپنے ساتھ رکھیں۔ اپنی قریبی شاخ سے رابطہ کر کے نیا کارڈ حاصل کریں۔ موجودہ کارڈز اپنی مدت ختم ہونے تک کارآمد رہیں گے۔

بہتر خدمت کی روایت

حبیب بینک لمیٹڈ

PID (Islamabad)

انوکھے خیال اچھوتی مثال

آنکھ مچولی
کراچی

مارچ ۱۹۹۷ء
شوال / ذیقعد ۱۴۱۷ھ

نگرانِ اعلیٰ
ظفر محمود شیخ

تحقیق و تصنیف
محمد سلیم مغل
محمد جاوید خالد

امورِ انتظامی
تجمل حسین چشتی
طارق فوزی

مشاورت
ڈاکٹر طاہر مسعود

امورِ تجارت
شاہد محمود

امورِ تشہیر
عبدالرحمٰن خان
سلطان بشیر (اسلام آباد)
فون نمبر : ۲۷۸۷۲۰

شعبۂ تزئین
محمد سلیم اختر (خطاطی)
مومن رحیم (اسکیچز)
دانش اختر (پینٹنگ)

واضح رہے ــــــ ۱

اس کتاب میں شائع ہونے والی تمام تحریروں کے جملہ حقوق بحق ادارہ (گرین گائیڈ اکیڈمی) محفوظ ہیں۔ بغیر اجازت کوئی بھی تحریر یا تصویر شائع نہیں کی جاسکتی۔

ــــــ ۲

اس کتاب میں شائع ہونے والی اسلامی اور تاریخی تحریروں (بشمول قرآن و حدیث) کے سوا جملہ کہانیوں کے کردار فرضی ہیں۔ کسی اتفاقیہ مماثلت کی صورت میں ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا۔

ــــــ ۳

اس کتاب کو گرین گائیڈ اکیڈمی نے ضمیر الدین میموریل آرگنائزیشن کے زیرِ سرپرستی بچوں کی ذہنی اور علمی صلاحیتوں کی نشوونما اور کردار سازی کے لیے شائع کیا۔

ــــــ ۴

آنکھ مچولی کا یہ کتابی سلسلہ وقتاً فوقتاً شائع ہورہتا ہے۔

قیمت ۲۰ روپے ۹ درہم ۹ ریال

زرِ سالانہ
۲۸۰ روپے (مع ڈاک خرچ) پاکستان
۱۰۰ ریال (مع ڈاک خرچ) مشرقِ وسطیٰ
۱۰۰ درہم (مع ڈاک خرچ)

جیمز پی گرانٹ

۱۵ سال تک یونیسف کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر رہنے کے بعد وہ گزشتہ سال اس دنیا سے کوچ کر گئے۔ انہوں نے بچوں کے حقوق اور ان کے مسائل کو عالمی سطح پر اٹھایا۔ ان کی خدمات کے باعث کروڑوں بچوں کی زندگیاں اندھیروں کی نذر ہونے سے بچ گئیں۔

ناشر : ظفر محمود شیخ
طابع : زاہد علی
مطبع : لاریب پرنٹنگ پریس، ایم اے جناح روڈ کراچی
فون نمبر : 4942857-4948210

خط و کتابت کا پتہ

آنکھ مچولی
گرین گائیڈ اکیڈمی، ۱۔ پی آئی بی کالونی، کراچی ۵

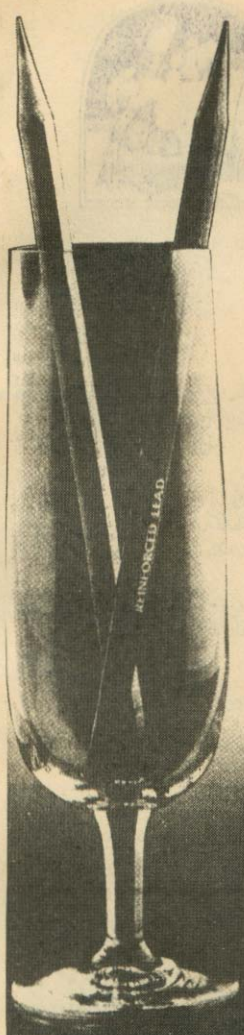

Lasting Impressions

From

Goldfish Autocrat®

Once you've used Goldfish Autocrat pencils
– no other pencil will do.
The new Goldfish Autocrat pencils
come with Reinforced Lead.

Available in "HB"
& all degrees of "H & B".

SHAHSONS (PVT) LTD.
D/88, Manghopir Road, Karachi, Phone: (92-21) 2577392-95 (4 lines)

فہرست

سنہرے حروف	ادارہ	۸
پہلی بات	ادارہ	۹
تری ہستی ہے سب سے پاک (حمد)	ریاض حسین قمرؔ	۱۰
چھوٹی عمر بڑا اعزاز	حافظ حسن عامر	۱۱
معصوم سی خواہش (نظم)	محمد علی انصاری	۱۴
بچّے اور جبری مشقت	مسرت اکرم	۱۵
آزادی جندہ باد	نذیر انبالوی	۲۰
اُداس بچّی (نظم)	محمد سلیم مُغل	۲۵
ابّو کا بچپن	کاشان جعفری	۳۰
سب سے بڑی دولت	عطاءالحق قاسمی	۳۸
درِ سماعت پہ دستک (نظم)	الطاف حسین	۴۲
مستقبل کی تلاش	نسرین شاہین	۴۴
انکشاف	جدون ادیب	۴۶
پاکستانی کرکٹ	عمران خالق	۵۱
وطن کی خاطر (حق اسکواڈ)	اخلاق احمد	۵۷
پاکستان کا بچہ	محمد جاوید خالد	۶۴
پہلا انعام	سلیم مُغل	۷۵
پیار کے گیت (نظم)	فاروق قیصر	۸۳
دولت	شاہ بلیغ الدین	۸۴
چوری کی روشنی	ابو غازی محمد	۸۷
ابھی تک دن نہیں نکلا (نظم)	نوید مرزا	۹۱
لطیفے شطیفے	منتخب لطائف	۹۳
تھپڑ کا راز	فاروق حسن چانڈیو	۹۷
امّی جان زندہ باد	محمد نصیر ہزاروی	۱۰۷
یہ تجدیدِ عہد کا دن ہے (نظم)	حفیظ الرحمٰن احسن	۱۱۳
لمحہ بہ لمحہ	آر۔ ایم۔ راھی	۱۱۵
گُم شدہ احساس	محمد اکبر رشید	۱۲۳
اے نونہالو! (نظم)	ضیاءالحسن ضیاء	۱۲۸
پُرانا کمبل	فوزانہ روحی	۱۲۹
جس کا کام	کمال احمد حازم	۱۳۴
قصّہ کوئز		۱۳۹
قلم دوست	نوآموز قلم کار	۱۴۳
اقرار	خالد بن محمود احمد	۱۵۴

سنہرے حروف

انیس درم ایک ایک لڑکے میں تقسیم ہوئے۔ ان لڑکوں کے باپ کا انتقال ہوا تھا اور جائیداد کا بٹوارہ ہو رہا تھا۔ مرنے والے نے اپنے پیچھے کل اکیس دینار چھوڑے تھے۔ اس میں سے دو دینار قبر کی زمین خریدنے کے لئے ادا کئے گئے، پانچ دینار کفن اور دوسری چیزوں پر لگے باقی رہے چودہ دینار ان کے درم بنائے گئے اور وارثوں میں تقسیم کئے گئے۔ یہ جس اللہ کے بندے نے وفات پائی تھی وہ کوئی معمولی آدمی نہ تھا، تاریخ اسلام کے عظیم ترین حکمرانوں میں اس کا شمار ہے۔ یعنی حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ جو اتنی بڑی سلطنت کے مالک تھے کہ ان کی سلطنت میں سورج غروب نہ ہوتا تھا اور حال یہ تھا کہ ایک سے دوسرا جوڑا کپڑوں کا پاس نہ تھا۔ بیت المال کو وہ امانت سمجھتے تھے اور عوامی خزانے کو اپنی یا اپنے اہل و عیال کی ذات پر بالکل خرچ نہ کرتے تھے۔

ان ہی کے ایک بھائی تھے ..... چچا زاد بھائی۔ ہشام بن عبدالملک! وہ بھی اسی سلطنت کے حکمراں رہے مگر ان کی بڑی شان تھی اور بڑا جاہ و جلال تھا۔ آخر کو موت انہیں بھی آئی، ہشام کا انتقال ہوا تو اس کی اولاد میں ترکہ تقسیم ہوا۔ ایک ایک لڑکے کے حصے میں دس دس لاکھ درم آئے۔ دونوں آگے پیچھے حکمراں رہے، دونوں ایک ہی سلطنت کے مالک رہے لیکن دونوں میں بڑا فرق تھا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے وقتِ آخر اپنے لڑکوں کو بلا کر پاس بٹھایا اور ان سے فرمایا۔

"تم پر میری جان قربان! تمہارے لئے میں نے دولت نہیں چھوڑی، لیکن اللہ کا شکر ہے کہ میں نے تمہاری بہترین تربیت کی ہے اور تمہیں صراطِ مستقیم پر چھوڑا ہے۔ لڑکو! تمہارے باپ کو دو باتوں کا اختیار تھا۔ ایک یہ کہ تم دولت مند ہو جاؤ اور گمراہیوں میں مبتلا ہو کر دوزخ میں جاؤ، دوسرے یہ کہ تمہارے پاس دولت [illegible] لیکن دولتِ ایمان سے تم مالا مال رہو اور صراطِ مستقیم پر چلتے رہو۔ میں نے تمہیں آگ سے [illegible] اللہ پر بھروسہ رکھو! اللہ تمہارا مددگار و محافظ ہے۔"

[illegible] ہے کہ ہشام کے لڑکے جنہیں ترکے میں لاکھوں ملے تھے ایک وقت ان پر ایسا آیا کہ دو لقمو[illegible] گئے تھے۔ حال یہ ہو گیا تھا کہ لوگ صدقہ دے جاتے تو کچھ منہ میں چلا جاتا اور عمر بن ع[illegible] کے جنہیں ترکے میں انیس انیس درم ملے تھے اس درجے کو پہنچے کہ جہاد کا موقع ہوتا تو خ[illegible] ایک ایک سو گھوڑے دیتے۔

پہلی بات

"بچہ" اللہ کی تخلیق کردہ حسین ترین چیزوں میں سے ایک ہے۔ اس کے حسن کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ وہ "انسان" ہے اور دوسرا یہ کہ وہ "بچہ" ہے۔ ہر بچہ بڑا ہونے کے لئے پیدا ہوتا ہے مگر ہر بچہ بڑا کب ہوپاتا ہے؟ ہزاروں لاکھوں بچوں کو ہر سال موت، ماؤں کی گود سے اچک کر لے جاتی ہے۔ اور ہم اسے اللہ کی رضا جانتے ہوئے رو پیٹ کر صبر کرلیتے ہیں۔ ہم میں سے کوئی یہ نہیں سوچتا کہ آخر جاپانی بچے اتنی بڑی تعداد میں کیوں نہیں مرتے؟ امریکی بچوں پر ایسی افتاد کیوں نہیں آتی؟ مغرب کے بچے ہمارے بچوں سے زیادہ صحت مند کیوں ہوتے ہیں؟ ان سوالوں کا جواب تلاش کرنے بیٹھو تو اپنی ہی غلطیاں سامنے آتی ہیں۔ والدین تعلیم یافتہ ہوتے تو بچوں کو موت کے چنگل سے بچانے کی تدبیر کرلیتے۔ ملک کا سیاسی اور حکومتی نظام اچھا ہوتا تو بچوں کی بقاء کی تدبیریں ہوتیں۔ قدم قدم پر ان کی صحت و تندرستی کے لئے مراکز کھولے جاتے، ذرائع ابلاغ بچوں کی بہتر نشوونما کے پروگرام پیش کرکے والدین کی تربیت کرتے۔ مگر وائے ناکامی کہ یہ سب کچھ نہیں ہوسکا۔ تشویش کی بات تو یہ ہے کہ ابھی تک اندھیرا چھٹتا نظر نہیں آتا۔

ہمارے ملک میں جو بچے ابتدائی عمر خیریت سے گزار کر کچھ بڑے ہو بھی جاتے ہیں تو وہ معاشی نظام کی چکی تلے پسنے لگتے ہیں۔ کمسنی میں دکھ جھیلتے ہیں۔ مشقتیں کرتے ہیں۔ تعلیم حاصل نہیں کرپاتے، بہتر غذا سے محروم رہتے ہیں اور یوں ذہنی اور جسمانی صحت کے زیاں کے ساتھ بڑے ہو بھی جائیں تو "بڑے" نہیں ہوپاتے۔ جہالت، ناخواندگی، حرص و ہوس اور خودغرضی کے عفریت بچوں کو سہمائے رکھتے ہیں اور یہ بچے "بڑے" نہیں ہوپاتے۔ ان بچوں کو آخر تو بڑا ہونا ہے۔ یہ "بڑے" نہیں ہوں گے تو قوم بڑی نہیں ہوگی اور عزت سے زندہ رہنے کا امکان بڑا نہیں ہوگا۔

ہم نے ان مسائل پر ہمیشہ آواز اٹھائی ہے۔ "اطفال پاکستان نمبر" بھی ایسی ہی آواز ہے۔ بچوں کے حقوق کے سلسلے میں ہونے والی جدوجہد میں اس شعر نے ہمیشہ ہماری رہنمائی کی ہے ؎

شکوۂ ظلمتِ شب سے تو کہیں بہتر تھا
اپنے حصے کا کوئی دیپ جلاتے جاتے

تری ہستی ہے سب سے پاک ہستی

ریاض حسین قمر

ہو صحرا، دشت ہو یا کوئی بستی
تری رحمت کی ہے بارش برستی

بنائے لفظِ "کن" سے دونوں عالم
بنائی ہے بلندی اور پستی

جہاں میں ہر جگہ ہے ذات تیری
مگر صورت کو ہے دنیا ترستی

نہیں تجھ سا کوئی دونوں جہاں میں
تری ہستی ہے سب سے پاک ہستی

عطا کردی کسی کو بادشاہی
کسی کو بخش دی ہے فاقہ مستی

بڑا بدبخت ہے انساں خدایا
تجھے چھوڑے، کرے

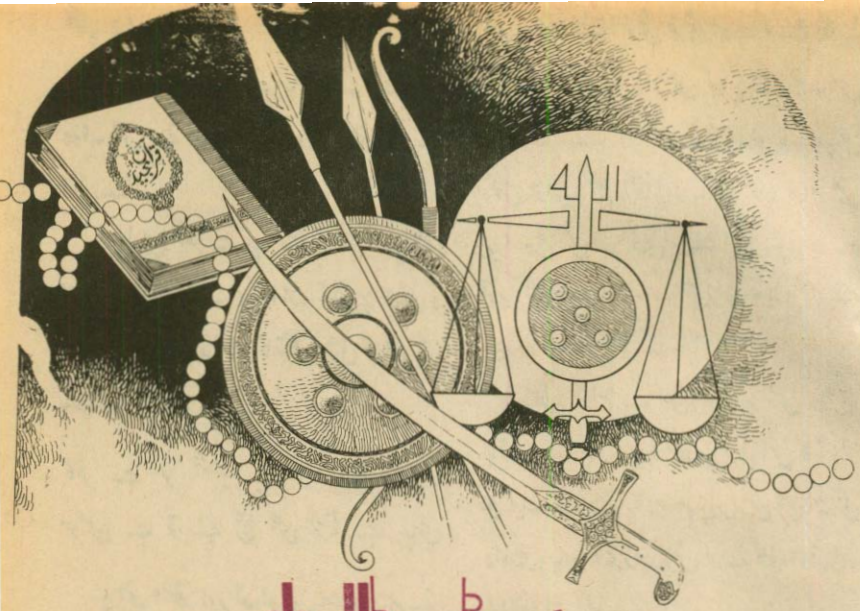

چھوٹی عمر بڑا اعزاز

حافظ حسن عامر

پورا ایک سال ان لوگوں نے تیاری میں گزارا تھا۔ ایک سال تک انہوں نے سینوں میں نفرت کی آگ سلگائی تھی اور شعلوں کو انتقام [illegible] دے کر بلند کیا تھا۔ اندازہ کیا جاسکتا [illegible] بے پناہ تیاری ان لوگوں کی رہی [illegible]

[illegible] کی پچھلے سال بھی تھی اور [illegible] لحاظ سے اس میں بھی بہت جوش و خروش تھا۔ مگر اب مقصد کے جوش میں انتقام کی چنگاریاں بھی شامل ہوگئی تھیں۔ یہ مکہ کے کفار و مشرک تھے۔ جنھوں نے اللہ کے دین کو مٹانا چاہا تھا اور اپنی بھرپور طاقت کے باوجود مٹھی بھر مسلمانوں نے ان کے دانت کھٹے کردیئے تھے، انہیں عبرت ناک شکست دی تھی۔ نتیجہ یہ کہ مکہ کے ہر کافر گھرانے میں صفِ ماتم بچھ گئی تھی۔ چنانچہ ایک سال کی تیاری سے تین ہزار کا

لشکرِ جرار جدید اسلحہ سمیت ایک دفعہ پھر مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لئے روانہ ہوا۔ اس نے اُحد پہاڑ کے دامن میں ڈیرے ڈال لئے۔

مسلمان لشکر کے سپہ سالار حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ جن کا اللہ تعالیٰ پر ایمان و یقین غیر متزلزل تھا، جن کا توکل مثالی تھا اور سچی بات تو یہی ہے کہ ؎

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسا
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

چنانچہ اسلحہ اور تعداد میں بہت کم ہونے کے باوجود محض اللہ کے بھروسے پر مسلمان بھی نکل کھڑے ہوئے کہ مسلمان زیادتی نہیں کرتا لیکن خود پر زیادتی ہونا برداشت بھی نہیں کرتا اور پھر ان کے حوصلے جوان تھے کہ انہوں نے پچھلے ہی سال اسلحہ اور تعداد میں بہت کم ہونے کے باوجود کافر سورماؤں کو جہنم رسید کردیا تھا اور جو بچ گئے تھے ان کے پاس فرار کے سوا کوئی راستہ نہ تھا۔ لیکن اس حوصلے سے بڑھ کر بھی ایک چیز مسلمانوں کے پاس تھی، جذبۂ جہاد اور شوقِ شہادت، یہی چیز تھی جو ان کے لئے ہر مشکل کو آسان کردیتی تھی، ہر دکھ کو سکھ میں تبدیل کردیتی تھی اور وہ ہنستے ہنستے، خوشی خوشی موت کو گلے لگانے کے لئے معرکۂ کارزار میں کود پڑتے تھے۔ اس چیز کا مکہ کے کیا، دنیا بھر کے کسی سورما کے پاس کوئی جواب نہیں تھا اور یہ چیز صحابہ کرامؓ میں پیدا ہوئی تھی اللہ تعالیٰ پر پختہ ایمان کی وجہ سے اور جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے بے پناہ محبت کی وجہ سے۔

صحابہ کرامؓ نے اس موقع پر جس روایتی جانثاری اور جانبازی کا مظاہرہ فرمایا اس کا تو ذکر ہی کیا۔ ننھے منے معصوم بچوں میں بھی اللہ کی راہ میں جان کا نذرانہ پیش کرنے کا وہ شوق اور ولولہ تھا کہ اللہ اکبر۔

جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے لشکر اسلام کو لے کر مدینہ منورہ سے کوچ فرمایا، تو مدینہ منورہ سے کچھ باہر نکل کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہ نفسِ نفیس لشکر اسلام کا جائزہ لیا اور از سرِ نو ترتیب فرمائی۔ آپؐ نے دیکھا کہ اس لشکر میں کچھ ایسے بھی نوعمر، کمسن اور معصوم بچے شامل ہیں جو ابھی سن شعور تک بھی نہیں پہنچے ان کو واپسی کا حکم ہوا۔ ان میں ایک بچہ ایسا بھی تھا جو دوران مشاہدہ بڑا ہونے کی بھرپور کوشش کررہا تھا۔ وہ اس خوف سے کہ کہیں واپس نہ کردیا جائے بڑا نظر آنے کے لئے پنجوں کے بل

کھڑا ہوگیا۔ یہ کم سن مجاہد حضرت رافعؓ تھے۔ مگر پنجوں کے بل بہت دیر تک تو کھڑا نہیں رہا جاسکتا۔ واپسی کا حکم ہوا تو عرض کیا کہ "یارسول اللہؐ! میں تو تیرانداز بھی ہوں۔" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس بات کا علم ہوا کہ رافعؓ تیرانداز بھی ہیں تو آپؐ نے انہیں جہاد میں شمولیت کی اجازت مرحمت فرمادی۔ رافعؓ کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ کامیابی کی سرخی ان کے چہرے پر نمودار ہوگئی۔

ایک اور کم سن مجاہد حضرت سمرہ ابن جندبؓ کو جو حضرت رافعؓ کے ہی ہم عمر تھے، جب پتہ چلا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رافعؓ کو بھی جہاد میں شرکت کی اجازت دے دی ہے۔ تو وہ دوڑتے ہوئے رسول اللہؐ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ "یارسول اللہؐ! جب آپؐ نے رافعؓ کو اجازت دی ہے تو مجھے بھی اجازت مرحمت فرمایئے! کیونکہ میں تو رافعؓ سے زیادہ طاقتور ہوں اور انہیں کشتی میں بھی ہرا دیتا ہوں" رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پُرنور چہرے پر اس وقت ضرور مسکراہٹ نمودار ہوگئی ہوگی۔ آپؐ نے فرمایا: "اچھا تم دونوں کشتی لڑو' چنانچہ دونوں میں کشتی ہوئی تو سمرہ ابن جندبؓ نے رافعؓ کو کشتی میں پچھاڑ دیا۔ غرضیکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سمرہ ابن جندبؓ کو جہاد میں شرکت کی اجازت دے دی۔ یوں یہ دونوں ننھے مجاہدین میدان کارزار میں داد شجاعت دینے لگے۔

حضرت سمرہؓ نے حضرت رافعؓ کو کشتی میں تو پچھاڑ دیا تھا۔ لیکن ان کا ذوق جہاد اور شوق شہادت تو ناقابل شکست تھا جس کو دل میں لے کر وہ بڑے بڑے کافروں پر بڑھ چڑھ کر حملے کررہے تھے۔ اچانک تیر آیا اور حضرت رافعؓ کے حلق میں پیوست ہوگیا۔ تیر کو کھینچ کر نکالا گیا۔ لیکن اس کی نوک اندر ہی ٹوٹ کر رہ گئی۔ حضرت رافعؓ کے ہونٹوں پر ایک خوبصورت مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ایک ایسی مسکراہٹ جو بہت بڑی کامیابی کے بعد ہی نمودار ہوسکتی ہے۔

دیکھنے والوں نے اناللہ وانا الیہ راجعون پڑھا لیکن رافعؓ کے ہونٹوں پر یقیناً" اس وقت وہی الفاظ ہوں گے جو ایسے موقع پر ہر صحابیؓ کے لب پر ہوتے تھے یعنی "رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہوگیا۔"

محمد علی انصاری

معصوم سی خواہش

جب دنیا کو سیاہ اندھیرے گود میں اپنی لے لیں
آسماں پر تارے مل کر آنکھ مچولی کھیلیں
دریاؤں کی ساری موجیں جب ساکت ہوجائیں
اپنے اپنے مسکن میں جب چڑیاں سب سوجائیں
تب میرا یہ دل چاہے میں آسماں پر جاؤں
ننھے منے ان تاروں کو اپنا دوست بناؤں
کھیلوں ان کے سنگ میں بھی آنکھ مچولی
جھل مل کرتے ان تاروں سے بھرلوں اپنی جھولی
پھر ان سب کو ساتھ میں لے کر اپنے دیس میں آؤں
ان کو اپنی بہنا، بھیا سب ہی سے ملواؤں
قریہ قریہ کوچہ ان کو لے کر گھوموں
تارے کیسے دوست ہیں میرے، سوچ سوچ کر جھوموں
میری یہ ننھی سی خواہش یارب پوری کردے
چاند ستاروں سے تو میری خالی جھولی بھردے

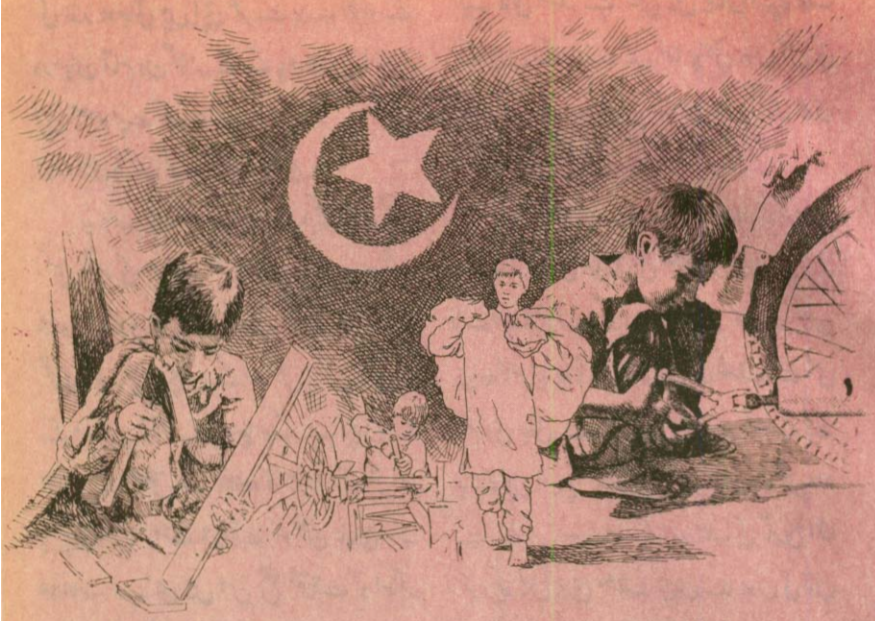

بچے اور جبری مشقت

مسرت اکرم

بچوں کے عالمی دن کے موقع پر ساری دنیا میں بچوں کے حقوق کے حوالے سے معاشرے کی معزز شخصیات حکومت اور سماجی تنظیمیں بچوں کے لئے خوبصورت باتیں کرتی نظر آتی ہیں۔ بچوں کو نعمتِ خداوندی، قوموں کی پہچان کہا جاتا ہے۔بڑے بڑے سیمینارز کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ قراردادیں پاس ہوتی ہیں لیکن بچوں کے مسائل ہمیشہ جوں کے توں رہے۔

دراصل دوہری پالیسی ہمارے کردار کا خصوصی حصہ بن چکی ہے۔ہر شعبہ زندگی میں یہی کچھ ہوتا ہے، کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ ہیں بچوں کے حقوق کی باتیں کرنے والوں کی کوٹھیوں میں جھانکیئے بہت سے معصوم بچے ان کی اور ان کے بچوں کی خدمت کرتے نظر آئیں گے ہوٹلوں میں، ورکشاپوں، فیکٹریوں اور قالین کے اڈوں پر ننھی جانیں جبری طور پر محنت و مشقت

کی نذر ہوجاتی ہیں۔اپنی عمر سے بڑے افراد کے درمیان تمام دن گزارنے کے باعث ان کا بچپن اپنی معصومیت کھودیتا ہے۔وہ اپنی عمر سے کہیں زیادہ بڑی باتیں کرتے نظر آتے ہیں۔

یہ سب کچھ ہم سب روزانہ دیکھتے ہیں لیکن کسی قسم کی حرکت ہم میں پیدا نہیں ہوتی۔ بیسویں صدی میں گوکہ انسانی حقوق کے مسئلے کو تحریک ملی۔یوں بچوں کے مسائل پر بھی عالمی دن کے موقع پر تواتر سے سوچا جاتا ہے۔بچوں کے حقوق کے متعلق سنہ ۱۹۲۴ء کا جنیوا اکنونشن ہو یا چلڈرنس رائٹ ڈرافٹ کنونشن مارچ سنہ ۱۹۸۹ء۔ سب ہی میں اس تلخ حقیقت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ دنیا کے تمام ممالک خصوصا تھرڈ ورلڈ کے بچے اور ان ملکوں کے بچے جو ایک دوسرے سے متصادم ہیں پریشان کُن صورتِ حال اور غیر انسانی ماحول میں زندگی بسر کررہے ہیں۔بوسنیا، سربیا اور کروشیا کی خانہ جنگی میں ہزاروں بچے یتیم اور بے آسرا ہوچکے ہیں۔لاکھوں بچوں مشتمل ایک ایسا گروہ تیار ہوچکا ہے جن کے لئے زمین سخت اور آسمان بے رحم ہے۔

یہ بچے پھر بھی کہیں نہ کہیں ضرور جگہ پالیں گے۔کچھ ممالک اس سلسلے میں کام کررہے ہیں یہ ایک عالمی مسئلہ ہے لیکن میں یہاں اپنے ملک کے بچوں کے بارے میں کہنا چاہتی ہوں جن کی ایک بڑی تعداد والدین کے ہوتے ہوئے بھی جبری مشقت کرتی نظر آتی ہے۔

گھریلو ملازمین سے لے کر بھٹہ فیکٹریوں، ویلڈنگ، قالین سازی کی صنعت، گیراجوں میں دن رات محنت کرنیوالے ان بچوں سے ان کی عمر سے کہیں زیادہ کام لیا جاتا ہے جبکہ اجرت نصف سے بھی کم دی جاتی ہے۔ یہ تمام حقوق جو غصب کئے جاتے ہیں ان پر کسی کی نظر نہیں جاتی۔مارشل لاء سے لے کر جمہوریت کے دور تک کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں، جبری مشقت بچوں سے جوں کی توں لی جاتی رہی ہے، قانون کی کتابوں میں تمام قانون مردہ نظر آتے ہیں۔ ۴۵ فیصد آبادی ایسے بچوں پر مشتمل ہے، جن کی عمر پندرہ سال یا اس سے بھی کم ہوتی ہے۔ انتہائی غربت و افلاس میں زندگی بسر کرنے والے ۸۶ فیصد بچوں کو ان کے والدین درسگاہوں میں نہیں داخل کرواتے بلکہ چھوٹی چھوٹی ملازمتوں پر روزانہ اجرت پر لگادیتے ہیں تاکہ ان کا بوجھ کم ہوسکے۔بچوں کی تعداد زیادہ ہونے کے باعث وہ ایسا کرنے پر مجبور ہوتے ہیں ان کو اس بات کا علم ہوتا ہے کہ حکومت کی جانب سے کوئی ایسا قانون نہیں ہے جس کی پکڑ

میں وہ آئیں گے کہ وہ اپنے بچے سے جبری مشقت کیوں لے رہے ہیں۔ پاکستان میں بچوں سے جبری مشقت لینے کا رجحان شرمناک حد تک زیادہ ہے۔ اگر آپ چلڈرنس رائٹ ڈرافٹ کنونشن مارچ سنہ ۱۹۸۹ء کا مطالعہ کریں تو آرٹیکل ۳۲ کے تحت کہا گیا ہے کہ بچے کے حق کو تسلیم کیا جائیگا اگر کوئی کام اسکے لئے نقصان دہ ہو یا بچے کی جسمانی، ذہنی بالیدگی اور سماجی ترقی کے لئے نقصان دہ ہو۔ لہٰذا شریک ممالک اس آرٹیکل پر عملدرآمد کو یقینی بنانے کے لئے ضروری سماجی قانونی انتظامات کریں۔

۱۔ کم عمر بچوں کو ملازمت نہ کرنے دی جائے ملازمت کے لئے زیادہ سے زیادہ عمر کا تعین کیا جائے۔

۲۔ کم عمر نوجوانوں، بچوں کی ملازمت کی شرائط اور اوقاتِ کار کے لئے مناسب ضابطہ نافذ کیا جائے گا اور اس آرٹیکل کو مؤثر بنانے کے لئے جرمانے اور سزاؤں پر غور کیا جائے گا۔

☆ --- ☆ --- ☆

اگر ہم دو قراردادوں کے بارے میں تجزیہ کریں تو کتنی خوش کن باتیں کی گئی ہیں مجھے دکھ ں وقت ہوتا ہے جب بچوں کے حقوق اور م ائل پر نہ صرف قومی سطح پر بلکہ عالمی سطح پر بڑے بڑے سمینارز کا انعقاد کرکے ناقابل عمل منصوبہ جات کی باتیں کی جاتی ہیں۔ ہونا تو کچھ یوں چاہیے کہ

۱۔ قانونی طور پر والدین کو اس بات پر پابند کیا جائے کہ وہ اپنے بچے کو پانچ سال کی عمر تک درسگاہ میں داخل کروادیں ایسا نہ کرنے کی صورت میں قانونی کارروائی کی جائے۔

۲۔ تعلیم کو مفت کیا جائے کتابوں کی خریداری سے لے کر یونیفارم تک پرائمری جماعتوں تک مفت فراہم کی جائیں اس طرح خواندگی کا گراف بڑھے گا تعلیم جب مفت ہوگی تو یقیناً والدین بچوں کو درسگاہوں میں داخل کریں گے۔

۳۔ کارخانوں، فیکٹریوں، قالین سازی کی صنعت، ورکشاپس میں کمسن بچوں کے کام کرنے پر پابندی عائد کی جائے۔ تقریباً ۱۴ یا ۱۵ سال کے بچے کو کام دیا جائے تو ان کے کھانے کی ذمہ داری بھی مالکان پر ڈالی جائے اور اجرت بھی اوقات کے حساب سے دی جائے۔

۴۔ قانونی کارروائی کو سخت بنایا جائے تاکہ بچوں سے جبری مشقت نہ لی جاسکے وہ بچے جن کو بھیک مانگنے پر مجبور کیا جاتا ہے ان کو بھی معاشرتی تحفظ فراہم کیا جائے اور ایسا کام کروانے والوں کو سخت ترین سزا دی جائے۔

۵۔ جبری مشقت تو بچوں سے لے لی جاتی ہے لیکن مناسب اجرت بچوں کو نہیں دی جاتی۔کیا یہ ظلم نہیں کہ تمام دن کمسن بچے محنت کریں اور ۵ روپے دے کر ان کو رخصت کردیا جائے جو کہ نہایت ہی نامناسب بات ہے۔

بچوں سے جبری مشقت پر سختی سے پابندی عائد کی جائے کیوں کہ بچوں کے مسائل میں سے یہ مسئلہ ہے۔ جب ہم بچوں ۔ بات کرتے ہیں تو ان کو دیانت داری بھی کیا جائے۔صرف قرار داد بنالینے سے مسائل حل نہیں ہوتے۔والدین کو چاہئے کہ وہ بچوں سے ان کی عمر سے زیادہ کام نہ لیں۔کیونکہ یہ نرم کونپلیں ہیں جو لاپرواہی سے ٹوٹ بھی سکتی ہیں۔

مجھ سے ملیئے

دیہات میں اکثر بچے اپنے والدین کے ساتھ کھیتوں میں کام کرتے نظر آتے ہیں۔ دکانوں' اور بعض فیکٹریوں وغیرہ میں بھی کمسن بچے مزدوری کرتے نظر آتے ہیں۔ سڑکوں' فٹ پاتھوں اور چوراہوں پر بہت سے بچے پھول' اخبار بیچتے گاڑیاں صاف کرتے اور بوٹ پالش کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ بچے شوقیہ محنت نہیں کرتے ان کا دل بھی اسکول جانے کے لئے مچلتا ہے۔لیکن وہ محنت مشقت کرنے پر مجبور ہیں کیونکہ انہیں علم ہے کہ اگر وہ محنت نہیں کریں گے تو اپنا اور کنبے کے باقی افراد کا پیٹ کیسے بھریں گے۔

کل نہیں آج

"دنیا کی ہر چیز انتظار کر سکتی ہے مگر "بچہ" نہیں۔ بچپن وہ دور ہے جب ہڈیاں نشوو نما پاتی ہیں، رگوں میں خون بنتا ہے اور دماغ اپنی تکمیل کا سفر کرتا ہے۔ اس لیے ہم بچے کو یہ کیسے کہہ دیں کہ "آج" نہیں "کل"۔ "آج" بچے کا ہے، اسے کل پر نہ ٹالیے۔"

"گیبریلا مسترال" نوبل انعام یافتہ بچوں کا شاعر

آزادی چند روز باد

نذیر انبالوی

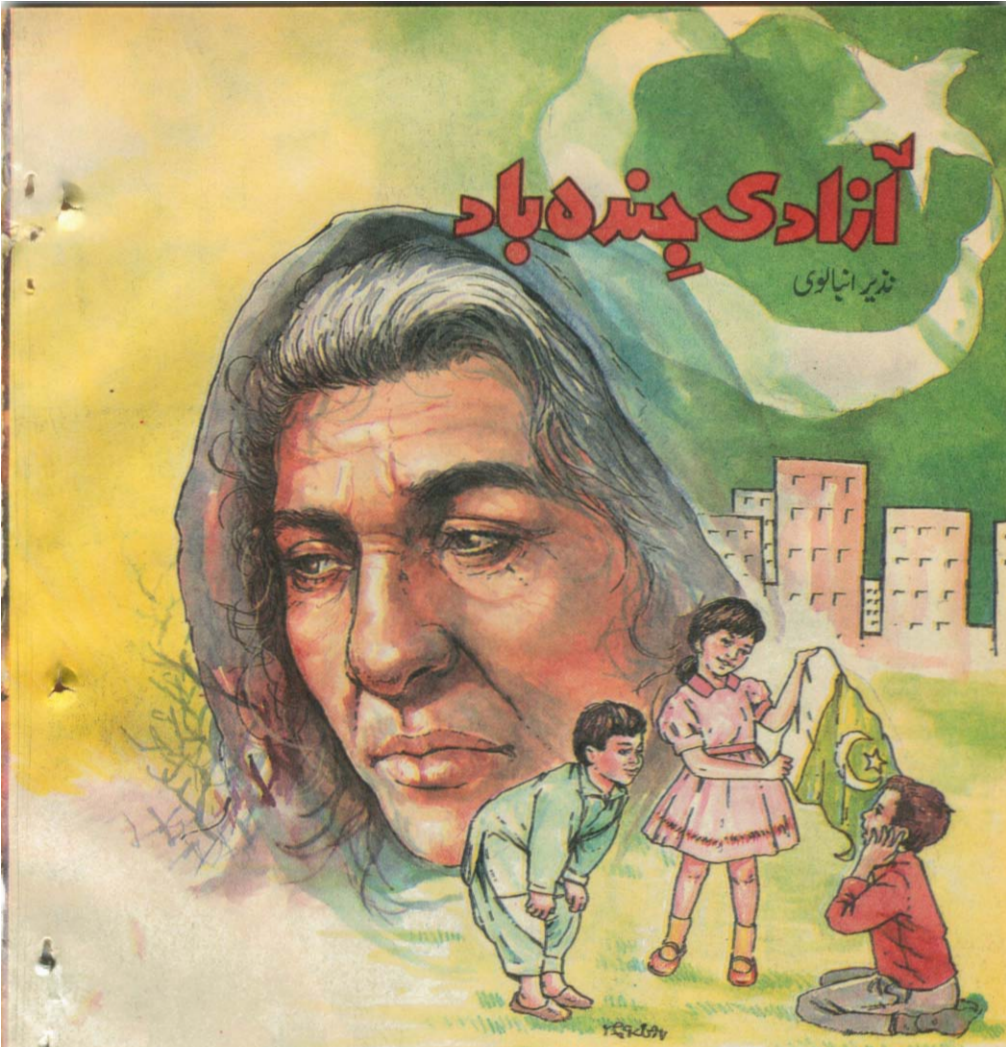

میں اپنی لاٹھی ٹیکتے ہوئے اس امید پر بازار سے گزر رہی تھی کہ شاید کوئی مجھے پہچان لے مگر ایسا نہیں ہوا' سب اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ میں سپر مارکیٹ کے پاس پہنچی تو میرے کانوں میں یہ آواز آئی۔

"بہن جی یہ استری پاکستانی تو نہیں جو خراب ہو جائے گی یہ تو جاپانی ہے جاپانی.... یہ دیکھئے اس پر میڈ ان جاپان لکھا ہے۔"

"میڈ ان جاپان...." میں ہڑبڑا کر وہاں ٹھہر گئی۔ میں اب دائیں جانب کی دکان میں جھانک

سکتی تھی۔

"آپ تسلی سے لے کر جائیے یہ استری بہت اچھی ہے.... اس کی قیمت بھی بہت مناسب ہے ....." دکاندار مسلسل بولے جارہا تھا۔ خاتون نے استری الٹ پلٹ کر دیکھی اور "میڈ ان جاپان" کی مہر پڑھ کر بولی۔ "ٹھیک ہے یہ استری پیک کردیں۔"

دکاندار کے ہاتھ تیزی سے چلنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد خاتون پیسے ادا کرکے وہاں سے چلی گئیں۔

"یار تم تو ایک دم فراڈیئے ہو..... پاکستانی استری جاپانی بنا کر بیچ دی ....." دکاندار کا ایک دوست بھی اس کے پاس بیٹھا تھا۔

"گاہکوں کا تو اپنے ملک کے مال سے اعتبار ہی اٹھ گیا ہے .... یار یہ فراڈ نہیں کاروبار ہے کاروبار ....." دکاندار کی یہ بات سن کر میرے دل میں ایک ہُوک سی اٹھی' میں آگے بڑھ گئی۔ کوئی بھی تو میری طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ تھوڑی دور جانے کے بعد میں ایک بند دکان کے چبوترے پر بیٹھ گئی۔ میرا ذہن ماضی کے دروازے پر دستک دینے لگا تھا۔ میرے کانوں میں مسلمانوں کے جوشیلے نعروں کی آوازیں گونجنے لگی تھیں

لے کے رہیں گے پاکستان
بن کے رہے گا پاکستان

پاکستان کا مطلب کیا..... لاالہ الاّ اللہ

اب ماضی کی فلم میرے ذہن کے پردے پر چلنے لگی تھی۔ اب وہ منظر میرے سامنے تھا جب ۳ جون سنہ ۱۹۴۷ء کو قائداعظم دہلی ریڈیو سے مسلمانوں سے مخاطب ہوئے تھے۔ مسلمانوں کی خوشی دیدنی تھی' سب ایک دوسرے کو مبارکباد دے رہے تھے۔ قائداعظم نے اپنی پہلی نشری تقریر کے اختتام پر "پاکستان زندہ باد" کا نعرہ لگایا تو مسلمانوں نے اس نعرے کا بھرپور جواب دیا۔ ہر گلی کوچے میں پاکستان زندہ باد کے نعرے لگنے لگے۔ میں بھی اس دن بہت خوش تھی۔ منزل مل جانے کے بعد خوشی تو قدرتی امر ہے۔

اب میری آنکھوں کے سامنے اس عید کا منظر تھا جو آزادی کے چوتھے دن منائی گئی تھی۔ یہ بڑی عجیب عید تھی۔ اس عید پر نہ کسی نے مہندی لگائی' نہ نئے کپڑے بنائے۔ خون کی ہولی کے دوران ایک بچے نے اپنی امی سے پوچھا تھا۔

"امی جان کیا اس مرتبہ مجھے عیدی نہیں ملے گی ....."

"ہم سب کو عیدی مل چکی ہے.... اس عید پر آزادی سے بڑھ کر اور عیدی کیا ہوسکتی ہے۔ ہمیں آزادی مل گئی ہے ...." امی جان کی بات سن کر بچہ یوں سر ہلانے لگا جیسے ساری بات سمجھ

گیا ہو۔

ایک مرتبہ پھر منظر بدلا۔ ٹرین میں تین مائیں اپنے دودھ پیتے بچوں کو اپنے سینے سے لگائے بیٹھی تھیں۔

"بہن جی ان بچوں کو ہمیں دے دیں تاکہ انہیں دفن کیا جاسکے۔" رضاکار کے اتنا کہنے پر تینوں نے اپنے مردہ بچوں کو فوراً اپنی آغوش میں چھپالیا۔ ان تین ننھے شہیدوں کو دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

وہ منظر میں کس طرح بھلا سکتی ہوں۔ جو میں نے امرتسر سے لاہور آتے ہوئے ایک ٹرین میں دیکھا تھا۔ گاڑی میں ایک بڑھیا بیٹھی تھی۔ اس کی گود میں اس کا ننھا پوتا تھا۔ راستے میں اس کا بیٹا شہید ہوگیا۔ اس کی بہو کو سکھ اٹھا کر لے گئے' اس کا شوہر سکھوں کی کرپانوں کی زد میں آگیا۔ وہ چپ چاپ بیٹھی تھی اس کے لبوں پر آہیں نہ تھیں' اس کی آنکھوں میں آنسو نہ تھے'

"دادی اماں پانی....." بچہ بولا۔
دادی چپ رہی۔
"دادی اماں پانی۔" بچہ چیخا۔
"بیٹا پاکستان آئے گا تو پانی ملے گا۔"
"دادی پاکستان کب آئے گا.....؟"
"میرے بیٹے بہت جلد پاکستان آنے والا ہے.....؟"
"کیا وہاں مجھے پانی مل جائے گا؟....." بچے نے پوچھا۔
"ہاں ..... وہاں بہت سا پانی پینے کو ملے گا ..... بس اب چپ ہوجا..... اب سوجا ....." دادی اماں نے اس کے بال سہلائے۔ والٹن کیمپ میں پہنچ کر اس بچے کو پانی میسر آیا تو بے اختیار اس کی زبان سے "پاکستان زندہ باد" نکلا۔ دادی اماں نے محبت سے اسے اپنے سینے سے لگالیا۔

"او بڑھیا یہاں کیوں بیٹھی ہے۔ چل یہاں سے اُٹھ ..... چل چل جلدی کر ....." یہ آواز مجھے ماضی سے حال میں لے آئی۔ میرے سامنے ایک ادھیڑ عمر شخص کھڑا تھا۔

"اُٹھ بڑھیا اُٹھ .... پہلے ہی دکان کھولنے میں خاصی دیر ہوگئی ہے ....." میں بغیر کچھ کہے وہاں سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں بازار کے آخری کونے پر پہنچی تو پان کے ایک کھوکھے کے قریب ایک آدمی اخبار پڑھ رہا تھا۔ وہ ایک نظر اخبار پر ڈالتا اور پھر کھوکھے والے سے مخاطب ہوجاتا۔

"بابو میاں ہمیں پاکستان حاصل کرنے کا کیا فائدہ ہوا' اس سے اچھے تو انگریز کے وقت تھے۔ چین سے روٹی کھانا تو نصیب ہوتی تھی اب تو ہر وقت جان کا ڈر ہی رہتا ہے.... پاکستان نے ہمیں

کچھ بھی تو نہیں دیا....."

"ناشکرے ..... کہتے ہیں پاکستان نے کچھ نہیں دیا .... تم نے اسے کیا دیا ہے؟" میں بڑبڑاتی ہوئی بازار سے نکل آئی۔ سامنے ہی ایک اسکول تھا۔ وہاں بہت رش تھا۔

"بیٹے یہاں اتنا رش کیوں ہے؟" میں نے ایک آدمی سے پوچھا۔

"ماں جی اندر میٹرک کا امتحان ہو رہا ہے...."

"امتحان تو اندر ہو رہا ہے مگر باہر کیوں اتنا رش ہے؟" میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

"سب اپنے اپنے امیدواروں کی مدد کے لئے آئے ہیں....."

"امیدواروں کی مدد ....." میں نے دہرایا۔ میں ساری بات سمجھ گئی تھی۔

یہ پچھلی چودہ اگست کا واقعہ ہے۔ میں بھی آزادی کا جشن دیکھنے کے لئے باہر نکلی تھی۔ لوگ جشنِ آزادی جوش و خروش سے منا رہے تھے۔ سب لوگ بہت خوش تھے۔ سڑک سے نوجوانوں کی ٹولیاں اپنی موٹر سائیکلوں کے سائلنسر نکالے تیزی سے گزر رہی تھیں۔ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ ایک لمبے بالوں والے لڑکے کی موٹر سائیکل ایک دم میرے قریب آکر بند ہو گئی۔ وہ کافی دیر تک موٹر سائیکل اسٹارٹ کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ آخر میں نے اس سے پوچھ ہی لیا۔

"بیٹا تم نے اپنی موٹر سائیکل کا سائلنسر کیوں نکالا ہے؟"

"جشنِ آزادی منانے کے لئے ....." وہ فوراً بولا۔

"یہ آزادی کا جشن منانے کا کونسا انداز ہے...." لمبے بالوں والے نوجوان نے یہ سن کر مجھے ناخوشگوار انداز میں گھورا۔ اس سے قبل کہ میں اسے کچھ سمجھاتی، وہ تیز لہجے میں بولا۔

"بس اب لیکچر دینا مت شروع کر دیجئے گا ..... یہ کام میرے گھر والے اکثر کرتے رہتے ہیں۔"

"بیٹا سائلنسر نکال کر اس طرح لوگوں کے کانوں کا امتحان لینا جشنِ آزادی تو نہیں ..... یہ بات اچھی نہیں...."

"تم کون ہوتی ہو مجھے سمجھانے والی ..... جاؤ ..... جاؤ اپنا کام کرو...." لمبے بالوں والا لڑکا ایک دم آپ سے تم پر اتر آیا، میں خاموش ہو گئی۔ میں نے سوچا "تمہیں کیا بتاؤں کہ میں کون ہوں؟" لمبے بالوں والے لڑکے نے پلگ صاف کرنے کے بعد کِک لگائی اور موٹر سائیکل ایک جھٹکے سے اسٹارٹ ہو گئی۔ وہ جلد ہی میری نظروں

سے اوجھل ہوگیا۔ اس کی موٹر سائیکل کی آواز اب تک میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔

"یہاں کوئی بھی تو نہیں جو مجھے پہچان سکے ..... کسی کو بھی میری پروا نہیں ..... کسی کو میرا خیال نہیں ..... کیا سوچا تھا اور کیا ہوگیا ...." یہ کہتے کہتے میری آنکھوں تلے اندھیرا چھانے لگا۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہو۔

شام کے وقت میں ایک پارک میں پہنچی تو وہاں تین بچے اپنے ننھے ننھے ہاتھوں میں پاکستانی پرچم لئے ایک کونے میں بیٹھے تھے۔ میں بھی ان کے قریب جاکر کھڑی ہوگئی۔

"میرے ابو کہتے ہیں اس سال چودہ اگست کو پاکستان کی پچاسویں سالگرہ ہوگی ..... میں تو اس دن اپنے گھر پر بڑا سا جھنڈا لگاؤں گا ..... میں جشنِ آزادی مناؤں گا ..... میں آزادی جندہ باد (زندہ باد) کا نعرہ بھی لگاؤں گا ...."

"کیا تمہیں آزادی اچھی لگتی ہے .....؟" میرے سوال پر تینوں چونک پڑے۔

"کیوں نہیں آزادی کسے اچھی نہیں لگتی۔" تینوں یک زبان ہو کر بولے۔

"کیا تمہیں آزادی سے محبت ہے ....؟" میں نے دوسرا سوال کر ڈالا۔

"آزادی تو ہے ہی محبت کرنے والی چیز ..... میرے ابو کہتے ہیں آزادی سے بڑھ کر کوئی نعمت اس دنیا میں نہیں ...."

"تمہارے ابو درست کہتے ہیں .... کیا تم آزادی سے ملنا چاہو گے ....؟"

"آزادی سے ...." ایک بچے نے حیرت کا اظہار کیا۔

"ہاں آزادی سے ملاقات .... تمہارے سامنے آزادی کھڑی ہے .... پچاس سالہ آزادی .... میرا نام ہے آزادی ....." یہ سنتے ہی بچے "آزادی جندہ باد"... "آزادی جندہ باد" کے نعرے لگانے لگے۔ ان کے نعروں سے میرے ٹھنڈے جسم میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے اندھیرے میں ان ننھے بچوں نے ایک ننھا سا دیا روشن کر دیا ہو۔ یہ ننھا سا "روشن دیا" میری مایوسی کے سب اندھیروں کو چٹ کر جائے گا۔ مجھے یقین ہے۔ کیا آپ کو بھی ہے؟ اگر ہے تو دیر کیسی۔ ان ننھی آوازوں میں اپنی آواز ملائیں۔ ایک دفعہ وہی معصومیت لے کر ..... "آزادی جندہ باد!!!"

اداس بچی

سلیم مُغل

لبِ سڑک چلتے چلتے اک دن
جو میں نے دیکھا
کہ ایک بچی ڈری ڈری سی
کھڑی ہوئی ہے
سوال نظروں سے
میرے چہرے کو گھورتی ہے
زبان چپ ہے
مگر وہ آنکھوں کے زاویوں سے
مرے ذہن کو ٹٹولتی ہے
تو میں نے پوچھا کہ "کون ہو تم
کہاں سے آئی ہو؟ کچھ بتاؤ
تمہاری آنکھیں اداس کیوں ہیں
یہ پھول چہرہ ملول کیوں ہے
تمہارے تن پہ پھٹا پرانا
فراک کیسا؟
تمہارے بالوں کو

کیوں کسی نے نہیں سنوارا
کچھ اپنا دکھ تم مجھے بتاؤ
قریب آؤ"
وہ سہمی سہمی اداس بچی
قریب آئی
وہ میرے بالکل قریب آکر
مجھے بھی خود سا غریب پاکر
لگی وہ کہنے کچھ اس طرح سے
"مری کہانی عجیب تر ہے
جو سن سکو تو تمہیں سناؤں
مگر زباں سے میں کیا بتاؤں
مجھے حوادث نے کیسے پالا
مجھے تو قسمت نے مار ڈالا
مرے بزرگوں نے جانے کتنی
دعائیں کی تھیں
کہ ان کے گھر میں
عدم سے کوئی وجود آئے
بس ایک بیٹا ہو پھول سا جو
خوشی کی لے کر
نمود آئے
مگر مقدر میں جو لکھا ہو
وہ کب مٹا ہے
سو گھر میں آیا وجود میرا
ہوا اندھیرا
سنا ہے بیٹی تو برکتوں اور
رحمتوں کی نوید ہے پر
ہمارے گھر میں تو بیٹیاں اک
سوال بھی ہیں
نشانِ حزن و ملال بھی ہیں
سو میرے آنے پہ
کس لیے کوئی مسکراتا
خوشی سے مجھ کو گلے لگاتا
کہیں سے کوئی مٹھائی آئی
نہ پھول آئے
سبھی کھلونوں کو بھول آئے
میں لعنتوں کی، ملامتوں کی
تپش میں اتنی بڑی ہوئی ہوں
سڑک کنارے کھڑی ہوئی ہوں
تمہی بتاؤ
کہ میرا آخر قصور کیا ہے
یہ سارا قصہ حضور کیا ہے
مرا بھی جی چاہتا ہے، میں بھی
مدرسے جاؤں
مرے بھی ہاتھوں میں ہوں کتابیں
کسی قلم سے میں تختیوں پہ
نصاب لکھوں، حساب لکھوں

سارے بچوں کے ساتھ مل کر
سبق سناؤں
جو گیت، نغمے کتاب میں ہیں
وہ گنگناؤں
مگر یہ سب کچھ مرے نصیبوں میں
کب لکھا ہے
کتاب، کاپی، قلم، نہ کوئی دوات میری
ہے کتنی کم تر یہ ذات میری
تمہارے اتنے بڑے جہاں میں
کوئی کھلونا، مرے لیے
کیا نہیں بنا ہے؟
نہ کوئی گڑیا نہ شیر، بھالو مرے لیے ہے
غلیظ مٹی کے کچھ کھلونے
خود ہی بنا کر
میں کھیلتی ہوں
یہ دکھ بھی
خود ہی میں جھیلتی ہوں
جو دن مرے
کھیلنے کے تھے وہ
مشقتوں میں گزر رہے ہیں
یہ کیسی بے بسی ہے دیکھو
نہ جی رہے ہیں نہ مر رہے ہیں

کہاں سے آئی ہوں، لو سنو تم
میں ایک خانہ بدوش لڑکی ہوں
آج یاں ہوں تو
کل وہاں ہوں
میں ایک مفلس غریب ہوں اور
دکھوں کی دہلیز
گھر ہے میرا
اسی سڑک پہ بسر ہے میرا
میں روز و شب اس سڑک کنارے
کھڑی ہوئی
بھیک مانگتی ہوں
یہاں سے اکثر گزرنے والے
مری ہتھیلی پہ
اک چونی یا اک اٹھنی
تھما کے اس طرح دیکھتے ہیں
کہ جیسے دنیا کی ساری دولت نثار کی ہو
میں سوچتی ہوں
کہ کاش! ایسا بھی ہو کہ
اک دن
کوئی مسافر کہیں سے آئے
قریب آکر مجھے بلائے
مجھے بلا کر

محبتوں سے گلے لگائے
میں اس کے منہ سے
یہ لفظ سن کر
خوشی سے بس
جھوم جھوم جاؤں

کہ "آج سے تم ہماری بیٹی ہو
ساتھ آؤ
لبِ سڑک
یوں نہ دکھ اٹھاؤ"

●●●

یونیسیف ہی کے مطابق سنہ 1960 کی دھائی میں ہر سال 70 لاکھ بچے خسرہ سے ہلاک ہوجاتے تھے۔ 80 کی دھائی تک یہ تعداد کم ہو کر 30 لاکھ رہ گئی تاہم یہ بھی کم نہیں ہے جبکہ بچوں کو لاحق ہونے والی ایک اور بیماری تشنج سے ہر سال تقریباً 7 لاکھ بچے ہلاک ہوجاتے ہیں۔ تاہم اسہال اور نمونیہ سب سے خطرناک بیماریاں ہیں جو ہر سال 30 لاکھ بچوں کو موت کے منہ میں دھکیل دیتی ہیں۔ اس کے علاوہ پاکستان میں 40 فیصد بچے مناسب اور کافی غذا حاصل نہیں کرپاتے۔ ماں کی غذائی اور طبی ضروریات پوری نہیں ہوتیں اس لئے بچوں کی نشوونما بھی ٹھیک طرح سے نہیں ہوپاتی، چنانچہ پیدائش کے وقت اکثر بچوں کا وزن نارمل سے کم ہوتا ہے۔ پاکستان میں کم وزن کے بچوں کی شرح دیگر ترقی پذیر ممالک کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے جو ایک تشویشناک امر ہے۔ یہاں طبی سہولتیں ناکافی ہیں۔ زچہ اور بچہ کی دیکھ بھال کے مراکز شہروں میں کسی حد تک ضرور موجود ہیں لیکن دیہی علاقوں میں اس قسم کے مراکز کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ چنانچہ ان علاقوں میں زچہ اور بچہ کی زندگی کو مستقل خطرات لاحق رہتے ہیں۔ طبی سہولتوں کے فقدان کے باعث بچوں میں کوئی نقص رہ جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات بچے پیدائشی معذور پیدا ہوتے ہیں۔

پھول اور کلیاں

دنیا بھر میں ہر سال 20 نومبر کو بچوں کا عالمی دن منایا جاتا ہے۔ اس عالمی دن کے موقع پر یہ عہد کرنا چاہئے کہ بچے امیر ہوں یا غریب ان کا تعلق کسی ملک، علاقے یا براعظم سے ہو ان سب بچوں کے حقوق یکساں ہوں۔ بچے ہمارے معاشرے کا اور ہماری قوم کا مستقبل ہیں۔ اگر ہمیں اپنا اور اپنے ملک کا مستقبل بہتر بنانا ہے تو ہمیں بچوں کو روشن مستقبل کی ضمانت دینی ہوگی۔ بچوں کی عزتِ نفس کا تحفظ کرنا ہوگا۔ بچوں کی نشوونما کے لئے ایسے اقدامات کرنا ہوں گے جن سے وہ ہر قسم کے دباؤ سے نکل کر اپنے بہتر مستقبل کی طرف بڑھ سکیں۔ ہر بچے کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنا والدین اور حکومت کا اولین فرض ہے۔ جو لوگ اپنی مجبوریوں کے باعث بچوں کو زیادہ تعلیم نہیں دلا سکتے ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے بچوں کو ہنر سکھائیں اور انہیں ایسے پیشے سے وابستہ کریں کہ وہ معاشرے میں عزت سے زندگی گزار سکیں اور معاشرے اور اپنی قوم کے لئے کار آمد فرد بن سکیں۔

ابّو کا بچپن

سیّد کاشان جعفری

میرے ابو نے بھارت کے مشہور صوبے اتر پردیش یعنی یو۔ پی کے مشہور صنعتی شہر کان پور میں ہوش سنبھالا۔ جب وہ طالب علم تھے تو ان کے اردگرد مولانا حسرتؔ موہانی، مولانا اسمٰعیل ذبیح، نشور واحدی جیسی جید، علمی، ادبی اور سیاسی شخصیتوں کا شہرہ تھا۔ ابو جان کو مولانا حسرتؔ موہانی جیسی عظیم، غیرت مند شخصیت کے گھر کھیلنے کا اتفاق ہوا اور نشور واحدی کے شاگرد ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔

میرے ابو بتاتے ہیں کہ جس وقت انہوں نے ہوش سنبھالا، دوسری جنگ عظیم ختم ہوئی تھی۔ وہ تیسری جماعت کے طالب علم تھے۔ اسکول میں جنگ ختم ہونے کی خوشی میں چھٹی کردی گئی تھی اور طلبہ میں مٹھائی اور تیل تقسیم کیا گیا تھا ابو گھر آئے تو ان کی امی یعنی میری دادی نے مٹھائی تو بچوں میں تقسیم کرادی اور سرسوں کا

تیل جو چراغاں کرنے کے لئے دیا گیا تھا، وہ گھر کے استعمال میں لے لیا گیا۔ آزادی کی تحریک فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو چکی تھی۔ دادی نے کہا "ہم چراغاں اس وقت کریں گے جب پاکستان کا مطالبہ تسلیم کرلیا جائے گا۔ مسلمانوں کو ان کی تہذیب، ان کی ثقافت اور ان کی تعلیم کی روشنی میں زندگی گزارنے کے لئے قائداعظم اور مسلم لیگ کے مطالبے کے مطابق مسلم اکثریتی علاقوں میں اپنی حکومت بنانے کا حق مل جائے گا۔

ابو جی نے اپنی امی کی یہ بات مان لی۔ پھر جداگانہ قومیت کی بنیاد پر الیکشن ہوئے۔ یہ سنہ ۱۹۴۵ء کی بات ہے۔ کان پور وہ شہر ہے جسے قیام پاکستان سے پہلے ہی یو۔ پی کا پاکستان کہا جانے لگا تھا۔

کان پور کے مشہور تعلیمی ادارے حلیم مسلم انٹر کالج (اب ڈگری کالج) میں پولنگ اسٹیشن بنایا گیا تھا۔ بڑے تو خیر تھے ہی سارے مسلم لیگ اور پاکستان کے حامی سارے محلے میں صرف ایک گھر کانگریسی خیالات کا حامی تھا اور وہ لوگ کانگریس کے اس قدر حامی تھے کہ اس گھر کے بچوں نے اپنے ابو کو باپو (ہندی میں باپ) کہنا شروع کردیا تھا۔ کانگریس کے مرکزی رہنما گاندھی جی کو بھی یہی خطاب حاصل تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے ہم قائداعظم کو "بابائے قوم" کہتے ہیں۔

ابو بتاتے ہیں کہ ان ہی دنوں مولانا اسمٰعیل ذبیح کے روزنامہ "قومی اخبار" کے دفتر میں جو اس وقت حلیم مسلم انٹر کالج کے عین مقابل اور مسلم جوبلی گرلس کالج کے برابر میں واقع تھا۔ مولانا حسرت موہانی، خود مولانا اسمٰعیل ذبیح، اشتیاق اظہر جو اس وقت نوجوان تھے اور ایک صحافی کے بیٹے انوار احمد جن کا تعلق ہفت روزہ "ہماری آواز" سے تھا آپس میں گفتگو کررہے تھے۔ ابو بھی اپنے ہم عمر ساتھیوں کے ساتھ پہنچ گئے۔ گفتگو بڑوں میں ہورہی تھی۔ موضوع تھا "کسے کیا کام اور کس طرح کرنا چاہئے؟" مولانا اسمٰعیل ذبیح نے ہنس کر جواب دیا۔ "ارے بھئی تم لوگ کیا کرو گے، تمہاری عمریں تو کھانے، کھیلنے اور پڑھنے کی ہیں جاؤ تمہارے لئے یہی بہت ہے۔" اس سے پہلے کہ ابو اُن کے جواب میں کچھ کہتے۔ مولانا حسرت موہانی نے مسکرا کر کہا۔ "کیوں نہیں بھئی کیوں نہیں۔ تم بچوں کے کرنے کے لئے بھی بہت کچھ ہے ..... بلکہ تم بچے ہی تو ہمارے کام کو گھر، گھر جاکر کرسکتے ہو جہاں ہم بڑے اور جوان نہیں جاسکتے وہاں تم پہنچ جاؤ گے اور پھر بچوں سے تو سب پیار کرتے ہیں۔

تمہاری بات کون ٹالے گا۔" یہ کہا اور پھر ابو کو قریب بلا کر سر پہ شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔ "بھئی تم مسلم بچہ لیگی کلب بنالو..... اور محلے محلے، گلیوں گلیوں پھیل جاؤ اور مسلم لیگ کا پیغام پہنچاؤ۔اس محفل میں نوجوان انعام درانی بھی موجود تھے جو پاکستان آکر "روزنامہ جنگ" سے وابستہ رہے۔ مسلم بچہ لیگی کلب کے بچوں کے لئے چند نعرے بھی تخلیق کردیئے گئے۔

دھیلے کی ڈلی، دھیلے کا پان
بن کے رہے گا پاکستان

دھیلہ اس وقت پیسے کا نصف حصہ ہوتا تھا اور اس کی بھی اچھی خاصی چیز مل جایا کرتی تھی۔ ایک نعرہ یہ تھا۔

سینے پہ گولی کھائیں گے
پاکستان بنائیں گے

مسلمانوں میں جناح کیپ مشہور تھی۔ یہ جناح کیپ بھی اسی صنعتی اور انقلابی شہر کان پور کی یادگار ہے۔ قائداعظم لکھنؤ جاتے ہوئے جب کان پور کے اسٹیشن پر رکے تو کسی مسلم رہنما نے انہیں یہ کیپ تحفہ کے طور پر پیش کی اور یہی ٹوپی ایک تاریخی حیثیت اختیار کر گئی۔ آج اس کیپ کو جناح کیپ کے ہی نام سے یاد کیا جاتا ہے۔اور یہ مسلمانوں کے سر پر ایک قومی نشان ہے بعد میں کانگریسیوں نے جناح کیپ کی شہرت اور مقبولیت سے متاثر ہو کر گاندھی کیپ متعارف کرانے کی کوشش کی اور وہ اس کوشش میں کامیاب بھی ہوئے۔ مگر اسے جناح کیپ جیسی قومی اہمیت حاصل نہ ہو سکی۔ گاندھی کیپ دراصل نہرو کی ٹوپی تھی۔ عام کھدر کے کپڑے کی بنی ہوئی۔ اس دور میں ننگے سر رہنا ایک معیوب بات سمجھی جاتی تھی۔ اس لئے گھر سے باہر نکلتے ہوئے ہر چھوٹا بڑا ٹوپی ضرور استعمال کرتا تھا۔ گاندھی کیپ کے متعلق آنکھوں دیکھا ایک واقعہ ابو مزے لے لے کر سناتے ہیں۔ پاکستان کے قیام کی منزل صرف ایک سال کے فاصلے پر رہ گئی تھی۔یہ سنہ ۱۹۴۶ء کا سال تھا۔ برطانوی حکومت کانگریسیوں کو گرفتار کر رہی تھی اور گرفتاری کا یہ سلسلہ بہت زوروں پر تھا۔ ابو جان اپنے ہم عمر ساتھیوں کے ساتھ مسٹن روڈ (اس دور میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی ملی جلی آبادی اور آج کا مشہور تجارتی علاقہ) سے گزر رہے تھے۔ وہ آگے، آگے سبز ہلالی پرچم تھامے چل رہے تھے۔ ایک لڑکا ادریس بڑے جوش کے ساتھ فضا میں مکا لہرا کر اور اچھل کر کہتا۔

ماریں گے ، مرجائیں گے

پھر دوسرے بچے اسی جوش سے کہتے

پاکستان بنائیں گے

ادریس کہتا "دھیلے کی ڈلی' دھیلے کا پان

دوسرے بچے جواب میں کہتے

بن کے رہے گا پاکستان

اس وقت چند کانگریسی گاندھی کیپ سروں پہ رکھے ہوئے ادھر سے گزر رہے تھے۔ اچانک سامنے سے چار گھوڑے سوار سپاہی آنکلے۔ اب ان کانگریسیوں کی بدحواسی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ انہوں نے اپنے سروں سے گاندھی کیپ اتار مٹھی میں دبائی اور قریب کی نالی میں پھینک کر الٹے پاؤں بھاگ کھڑے ہوئے .... ابو بتاتے ہیں کہ ان کے اس طرح ڈر کر بھاگنے سے ہم لوگ نعرے لگانا چھوڑ کر انہیں بھاگتے ہوئے دیکھ کر ہنسنے لگے۔ خود گھڑ سوار سپاہی بھی انہیں حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ اس کا مطلب صاف یہ تھا کہ وہ سپاہی معمول کے مطابق گشت پر تھے۔ کسی کو گرفتار کرنے کے لئے نہیں نکلے تھے۔

پولنگ والے دن مسلم لیگیوں اور کانگریسیوں کا جوش و خروش دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ مگر مقابلتاً" مسلم لیگیوں کے چہروں پر ایک خاص قسم کی چمک واضح طور پر نظر آرہی تھی اور یہ چمک اللہ تعالیٰ کی مدد اور اس کی حمایت کی چمک تھی۔ پولنگ اسٹیشن کی حدود کے ایک خاص حصے میں کسی بھی قسم کے نعرے لگانے' تقریر کرنے یا کسی بھی امیدوار' پارٹی کے حق میں کنوینسنگ کرنے کی مکمل پابندی تھی۔ ابو بتاتے ہیں کہ ہم بچوں کو بھی ہمارے بڑوں نے اس پابندی کا احترام کرنے کی ہدایت کردی تھی۔ مگر بچے تو بچے ہی ہوتے ہیں۔ وہ اگر ہر بات کی اونچ نیچ اور نشیب و فراز سمجھنے لگیں تو پھر وہ بچے کہاں رہے .... ابو بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ مسلم لیگ کا بیج لگائے' سبز ہلالی پرچم تھامے اپنے دوستوں کے ساتھ پولنگ اسٹیشن کے سامنے والی سڑک پر نعرے لگاتے پہنچ گئے۔ اس دن ان کے مخصوص نعروں میں ایک نعرے کا اور اضافہ ہوگیا تھا۔ وہ نعرہ تھا ؎

ایک چونی چاندی کی
اماں مرگئی گاندھی کی

اس دور میں چار آنے یعنی موجودہ ۲۵ پیسے کا سکہ چاندی کا بھی ہوتا تھا۔ بلکہ اٹھنی' پچاس

پیسے کا سکہ اور ایک روپیہ کا سکہ بھی چاندی کے ہی ہوتے تھے۔

معمول کے مطابق ادریس نامی لڑکا اپنے بھرپور جوش کے ساتھ کہتا۔

ایک چونی چاندی کی

دوسرے بچے اسی جوش و خروش کے ساتھ فلک شگاف نعرہ لگاتے

اماں مرگئی گاندھی کی

وہ سب بچے نعرے لگاتے ہوئے، پرچم لہراتے پولنگ اسٹیشن کے مین گیٹ کے سامنے پہنچ گئے۔ ابھی وہ چند نعرے ہی لگا پائے تھے کہ ہالٹ، ہالٹ کی صدا بلند کرتے چند برطانوی سپاہی گھوڑے دوڑاتے وہاں پہنچ گئے۔ ایک سپاہی نے بڑے رعب دار انداز میں کہا ....."اے بچو ..... جاؤ .... ادھر سے ..... یہاں نعرے لگانا منع ہے۔ اب نعرہ لگایا تو گولی مار دیں گے۔"

سپاہی کا اتنا کہنا تھا کہ ادریس نے اپنے پورے جوش کے ساتھ سینے پر ہاتھ مارا۔ پھر مکّا لہراتے ہوئے فضا میں اچھل کر نعرہ لگایا۔

سینے پہ گولی کھائیں گے

اور سب بچے ایک آواز ہو کر پورے جوش سے بولے۔

پاکستان بنائیں گے

ہمارے چہروں پر کوئی خوف نہیں تھا۔ بلکہ وہ تو جوش کی وجہ سے اور چمکنے لگے تھے۔

ایک اور سپاہی گھوڑے سے کود کر نیچے اترا۔ اس کا خیال تھا کہ ہم بچے، اسے اترتے دیکھ کر بھاگ جائیں گے۔ مگر ہم بھاگنے کے بجائے اور بھی جوش کے ساتھ نعرے لگانے لگے .... ہمارے گرد بہت سے بزرگ اور جوان بھی جمع ہوگئے تھے ..... موقعہ ہی ایسا تھا۔ پولیس کے سپاہی نے بے باک اور پرجوش ادریس کو اور ابو کو پکڑ لیا۔ پھر ان کے سروں پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔" جس قوم کے پاس، جس پارٹی کے پاس ایسے سپاہی موجود ہوں وہ اپنے مقاصد میں ضرور کامیاب ہوگی ۔ پاکستان ضرور بن کر رہے گا۔" اور پھر بچوں کو پیار سے سمجھا کر دوسری طرف نعرے لگانے کے لئے بھیج دیا .... اس طرح بچوں نے بھی تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ لیا۔

ابو کو سنہ ۱۹۴۶ء کا وہ جلسہ بھی یاد ہے جس میں قائداعظم نے بڑی درد مندی کے ساتھ یہ مشورہ دیا تھا کہ" مسلمان پہلے اپنے گھروں کی خبر لیں۔

مجھے معلوم ہے کہ مسلمان بہت دلیر ہیں' بہادر اور بے باک ہیں وہ میرے حکم پر اپنی جان' اپنا مال سب کچھ قربان کردیں گے۔ مگر ابھی اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں خون ریزی نہیں چاہتا بلند و بانگ دعووں کی ضرورت نہیں۔ کام کی ضرورت ہے اور عمل کی۔"

ابو کہتے ہیں ....." میں آج بھی محسوس کرتا ہوں جیسے قائداعظم سرگوشیوں میں ان سے یہی باتیں کہہ رہے ہیں۔ نصف صدی پہلے کہے گئے یہ الفاظ آج کے حالات میں بھی ہمیں یہی سمجھا رہے ہیں کہ ہمیں اپنے گھر کی فکر کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں کام اور صرف کام کی ضرورت ہے بلند و بانگ دعووں کی نہیں....."

پھر ۳ جون سنہ ۱۹۴۷ء کا وہ تاریخی دن آگیا۔ جب قیام پاکستان کا اعلان کردیا گیا۔ ہندوستان کے ان علاقوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں تھے۔ وہاں قتل و غارت گری اور لوٹ مار کا ایک جنونی سلسلہ شروع ہوگیا۔ مشرقی پنجاب اور دہلی کے مسلمانوں کو خصوصاً" ظلم و ستم کا نشانہ بنایا گیا۔ لیکن پاکستان کو چاہنے والے' اپنا قول نبھانے والے ہر قربانی کے لئے تیار تھے۔ انہوں نے آگ اور خون کے دریا پار کئے' اپنے پیاروں کی قربانیاں دیں' خود لٹے پٹے تھے لیکن امیدیں اور حوصلے تازہ دم تھے۔ پاکستان ان کی امیدوں کا مرکز اور ان کے حوصلوں کا نشان تھا۔ لیکن بقول ابو' پاکستان وہ نہیں بن سکا جو قائداعظم بنانا چاہتے تھے۔ ان پچاس سالوں میں پاکستان کو جہاں اور جس منزل پر ہونا چاہیے تھا پاکستان وہاں نہیں پہنچ سکا۔

پاکستان کے قیام کو برطانوی استعمار اور ہندو طاقتیں تو نہ روک سکیں مگر ان دونوں ازلی دشمنوں نے جو کام وہ خود نہ کرسکے وہ پاکستان کے میر جعفر' میر قاسم جیسے لوگوں کو اپنا آلہ کار بنا کر لے لیا۔ مگر اب ہم نئی نسل ان انسان نما بھیڑیوں سے بخوبی واقف ہوچکے ہیں۔ اب ہم پاکستان کو اس منزل تک پہنچائیں گے جس کا خواب قائداعظم نے دیکھا تھا اور جس مقصد کے لئے پاکستان وجود میں آیا تھا۔ آج کی نسل انشاء اللہ آنے والی نسلوں کو ایک خوش حال' ایک انصاف پرور پاکستان دے گی۔

کل کے بچے مسلم بچہ لیگی کلب کی صورت میں قائداعظم کے ساتھ تحریک پاکستان میں شریک تھے۔ آج کے بچوں کو اپنے وطن کی بقاء' فلاح اور ترقی کی تحریک میں اسی طرح حصہ لینا ہوگا۔ انشاء اللہ آئندہ پچاس سال میں پاکستان قرض لینے والے ممالک کی صف سے نکل کر

قرض دینے والے ممالک کی صف میں کھڑا ہو گا اور یہ کام آج کی نئی نسل انجام دے گی۔ بالکل اسی طرح جیسے کل کے بچوں نے پاکستان کے قیام میں اپنا رول ادا کیا تھا۔

یہ ہم تھے جو کل آئے تھے ظلمت کے مقابل
ہم کل بھی اندھیروں کو فنا کرکے رہیں گے

عمل سے زندگی بنتی ہے

ملکہ وکٹوریہ دنیا کے پانچویں حصے پر حکمران تھی۔ ایک روز اس نے اپنے اتالیق اور وزیر اعظم لارڈ ملبورن سے دریافت کیا کہ آپ نے تاریخ عالم کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ اس میں آپ کو سب سے حیرت انگیز بات کیا نظر آئی۔ لارڈ ملبورن نے بلا تامل جواب دیا۔ "اسلام کا عروج۔" اس پر ملکہ نے سوال کیا کہ آپ نے اس کے اسباب پر بھی غور کیا؟ اس نے کہا میری سمجھ میں تو ایک ہی بات آتی ہے کہ ان کے پیغمبر نے انہیں ہدایت کے لئے ایک کتاب (قرآن مجید) دی تھی۔ جب تک وہ اس پر عمل پیرا رہے، ترقی کی تمام راہیں ان پر کھلی رہیں۔ پھر جیسے ہی انہوں نے اس سے بے رخی برتنا شروع کی، ان کا زوال ہونے لگا۔ اگر کسی زمانے میں تاریخ نے اپنے آپ کو دہرایا اور مسلمان نے ایک قوم کی حیثیت سے پھر قرآن مجید کو مضبوطی سے پکڑا اور اپنی انفرادی اور قومی زندگی اس کے مطابق بنالی تو پھر ہم تو کیا، ساری دنیا ان کے زیر نگیں آجائے گی۔

مراسلہ: غلام عباس طاہر۔ جھنگ

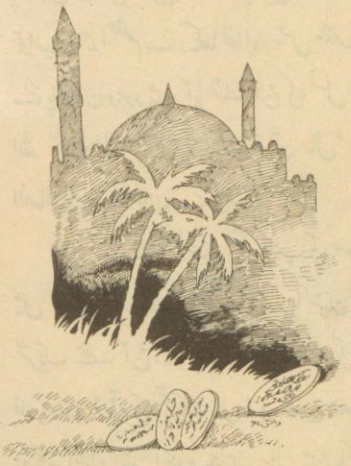

جتن کرتا ہے جو دن رات وہ آگے نکلتا ہے
بڑائی ہر کسی کی ذات کا حصہ نہیں ہوتی

عطاء الحق قاسمی

سب سے بڑی دولت

سعید کا اسکول ساڑھے سات بجے لگتا تھا۔ سات بج چکے تھے۔ لیکن وہ ابھی تک سو کر ہی نہیں اٹھا تھا۔ امی بھی شاید اسے جگانا بھول گئی تھیں۔

ناشتے کی میز پر سعید کے ابا نے پوچھا :

"کیا بات ہے، آج سعید نظر نہیں آرہا؟"

"اوہو، میں تو اسے جگانا بھول ہی گئی۔" سعید کی امی نے کہا اور اسے جگانے کے لئے کمرے کی طرف دوڑیں۔

سعید آنکھیں ملتا ہوا اٹھا اور غسل خانے کی طرف بھاگا، جلدی سے ہاتھ منہ دھو کر ناشتے کی میز پر پہنچ گیا۔ چونکہ دیر ہو چکی تھی اس لئے جھٹ پٹ ناشتہ کیا، کپڑے تبدیل کیے، بستہ بغل میں دبایا اور امی کو سلام کر کے اسکول کو ہولیا۔ اسکول لگنے میں صرف دس منٹ باقی رہ گئے تھے، اس لئے وہ تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔ اسے پتہ تھا کہ اگر وہ ایک منٹ بھی دیر سے اسکول پہنچا تو اس کی خیر نہیں اور ماسٹر محمد دین ڈنڈا لے کر اس کے گرد ہو جائیں گے۔ چنانچہ اس خیال نے اسے دوڑنے پر مجبور کر دیا مگر ابھی وہ دلدار کے کھوکھے تک ہی پہنچا تھا کہ اس کی دونوں ٹانگیں

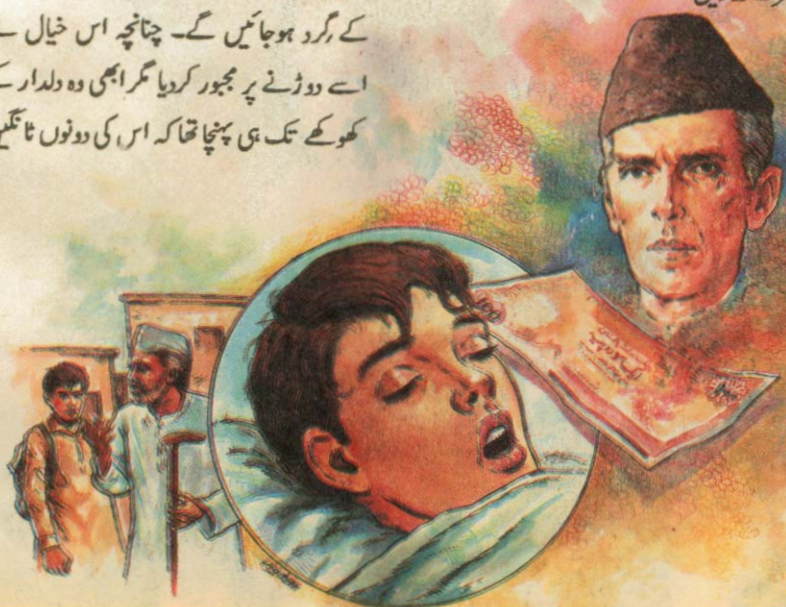

پھول گئیں اور درد کرنے لگیں۔

وہ کچھ دیر ستانے کے لئے ایک جگہ بیٹھ گیا' اچانک اس کی نظر سو روپے کے نوٹ پر پڑی' جو فٹ پاتھ کے قریب پڑا ہوا تھا۔ ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے ابھی ابھی کسی کی جیب سے گرا ہو۔ سعید نے جھک کر اسے اٹھالیا اور جیب میں ڈال کر چل پڑا۔

ابھی وہ تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ اسے سامنے سے حاجی خدا بخش آتے ہوئے دکھائی دیے۔ وہ غالباً" کچھ ڈھونڈ رہے تھے۔ سعید حاجی صاحب کو جانتا تھا۔ وہ اس کے مکان کے قریب ہی رہتے تھے۔ اس نے انہیں سلام کیا۔

حاجی صاحب نے سلام کا جواب دیا اور پوچھا :

"سعید بیٹا! میرا ایک سو کا نوٹ رستے میں کہیں گر گیا ہے تم نے تو نہیں دیکھا؟"

سعید ایک اچھا لڑکا تھا اور یہی وجہ تھی کہ محلے کے سب لوگ اس کی عزت کرتے تھے مگر اس وقت نہ جانے اسے کیا ہوگیا؟ اس نے جھوٹ بولتے ہوئے کہا :

"جی نہیں ..... میں نے ..... تو نہیں ..... دیکھا۔"

اس وقت اس کے چہرے کا رنگ تبدیل ہوگیا تھا اور زبان کے ساتھ ساتھ اس کی ٹانگیں بھی لڑکھڑانے لگی تھیں۔ مگر حاجی صاحب نے اس کی اس حالت کو نہیں دیکھا۔ وہ کچھ دور آگے جاکر اپنا نوٹ ڈھونڈنے لگے۔

سعید اب یہاں کھڑا نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اس نے اپنی رفتار اور تیز کردی۔ بھاگم بھاگ اسکول پہنچ گیا۔

ہر روز اس کی جیب میں چند پیسے ہوتے تھے اور وہ اپنے دوستوں میں سراونچا کرکے چلا کرتا تھا' لیکن آج اس کی جیب میں سو کا نوٹ تھا۔ پھر بھی وہ اپنے آپ کو سب سے زیادہ گھٹیا محسوس کررہا تھا۔ وہ چپکے سے اپنی کلاس میں جاکر بیٹھ گیا' لیکن آج اس کا دھیان ماسٹر صاحب کی طرف بالکل نہیں تھا۔

ماسٹر صاحب ریاضی کا کوئی سوال سمجھا رہے تھے اور سعید سوچ رہا تھا کہ وہ شام کو صادق کی دکان پر جائے گا اور پیٹ بھر کر آلو چھولے کھائے گا۔ اس کے بعد وہ چیپ اسٹور جاکر کوکا کولا اور ہیکو آئس کریم اڑائے گا۔

جب خالد اس کے پاس نیا ہیٹ دیکھے گا تو کتنا جلے گا کیونکہ کل جب اس نے خالد سے اس کا ہیٹ کچھ دیر کے لئے مانگا تھا تو اس نے کیسے صاف انکار کردیا تھا..... "ہم نہیں دیتے"۔

..... اس پر اسے غصہ تو بہت آیا تھا مگر وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ لیکن آج، آج وہ اپنا ہیٹ سب دوستوں کو باری باری دکھائے گا اور خالد کے بچے کو ہاتھ تک نہیں لگانے دے گا..... کتنا جلے گا وہ ..... سعید کلاس میں بیٹھا اسی قسم کی باتیں سوچتا رہا۔ یہاں تک کہ اسے پتہ ہی نہیں چلا کہ چھٹی کی گھنٹی کب بجی۔ وہ کتابیں اپنی بغل میں دبائے گھر چلا آیا۔

گھر جاکر سعید نے کپڑے تبدیل کیے اور کھانا کھایا ..... کھانا کھاتے ہی وہ معمول کے مطابق بستر پر لیٹ گیا ..... لیکن آج نیند اس سے کوسوں دور تھی۔

جیب میں پڑا ہوا سو کا نوٹ اسے بار بار باہر جانے کے لئے اکسا رہا تھا..... لیکن سعید مجبور تھا۔ اس کے ابا دوپہر کو اسے بالکل گھر سے باہر نہیں نکلنے دیتے تھے۔

آخر خدا خدا کرکے اس کی آنکھوں میں نیند آہی گئی ..... اور تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ خوابوں کی دنیا میں کھو گیا۔

یکایک اس نے دیکھا کہ سو کا نوٹ اس کی جیب سے نکل کر سامنے والی میز پر جاگرا ہے۔ سعید نے اسے پکڑنے کے لئے ہاتھ بڑھایا لیکن وہ اڑ کر اور پرے چلا گیا۔

سعید حیرت سے اسے دیکھنے لگا..... پھر اس کی نظریں جمی کی جمی رہ گئیں.....!

قائداعظم کی تصویر جو نوٹ کے کونے پر چھپی ہوئی تھی..... اسے حرکت کرتی ہوئی دکھائی دی ..... اور پھر تھوڑی دیر بعد قائداعظم اس کے سامنے کھڑے تھے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے ..... ایسے معلوم ہوتا تھا، جیسے وہ بہت زیادہ مغموم ہوں ..... سعید کانپ کر رہ گیا ..... اسے اپنا جرم یاد آگیا۔ وہ سمجھ گیا کہ قائداعظم کی آنکھوں میں آنسو کیوں ہیں ..... شرم سے وہ ان کے قدموں میں گر پڑا، مگر انہوں نے بازو سے پکڑ کر اسے اٹھالیا اور اپنے سینے سے لگالیا۔ پھر اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے :

"میرے بچے! میں جانتا ہوں کہ تم ایک اچھے لڑکے ہو۔ تم نے زندگی میں پہلی بار شیطان کے کہنے پر یہ حرکت کی۔ اس لئے میں تم سے زیادہ ناراض نہیں ہوں.....!"

"میرے بچے! تم پاکستان کی امانت ہو۔ تم نے بڑے ہو کر حکومت کی باگ ڈور سنبھالنی ہے۔ تم نے ہی پاکستان کو ترقی کی منزلوں تک پہنچانا ہے اور دنیا کو بتانا ہے کہ پاکستانی بچے دنیا کے بہترین بچے ہیں.....!"

یہ کہتے کہتے قائداعظم کی آواز بھرا گئی اور

ان کی آنکھیں ایک بار پھر آنسوؤں سے تر ہوگئیں۔ انہوں نے اپنی آواز درست کی اور بات جاری رکھتے ہوئے کہا :

"بیٹا! یہ سب کچھ اسی طرح ہوسکتا ہے کہ تم بچپن ہی سے اچھے اصولوں پر عمل کرو، تاکہ جب تم بڑے ہو تو پاکستان تم پر اور تم اپنے پیارے پاکستان پر فخر کرسکو۔"

سعید اپنے پیارے قائداعظم کی باتیں سن رہا تھا اور دل میں ایک نیا ولولہ محسوس کررہا تھا۔ وہ بار بار اپنے آپ کو کوستا تھا کہ اس نے ایسی بری حرکت کیوں کی۔ اتنے میں اسے یوں محسوس ہوا کہ جیسے اسے کوئی جھنجھوڑ رہا ہو۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔ دیکھا تو امی سرہانے پر کھڑی کہہ رہی تھیں :

"کیا آج سارا دن سونے کا ارادہ ہے۔ اٹھ کر اسکول کا کام کرو۔"

سعید ایک دم اچھل کر کھڑا ہوگیا۔ سو کا نوٹ اس وقت بھی اس کی جیب میں تھا۔ وہ دوڑتا ہوا گھر سے باہر نکل گیا۔ حاجی خدا بخش مسجد سے نماز پڑھ کر گھر کی طرف جارہے تھے۔

سعید نے انہیں روک کر نوٹ ان کے ہاتھ میں تھمادیا اور بولا :

"حاجی صاحب! مجھے معاف کردیجیے.....! میں نے آپ سے صبح جھوٹ بولا تھا۔"

حاجی صاحب پہلے تو حیرت سے اس کا منہ تکتے رہے، پھر ایک دم انہوں نے اسے سینے سے لگالیا۔

سو کا نوٹ واپس دے کر سعید کو یوں محسوس ہوا جیسے اسے دنیا کی سب سے بڑی دولت مل گئی ہے۔ اس وقت سعید روحانی خوشی محسوس کررہا تھا اور قائداعظم اسے مسکراتے ہوئے نظر آرہے تھے۔

●●●

دنیا کا سب سے کم عمر کمانڈر انچیف جس نے میدان جنگ میں فوجوں کی کمان سنبھالی ڈیوگ گاڈفرے تھا۔ جس کی عمر اس وقت تین ماہ کی تھی۔ وہ اپنے باپ کا جانشین تھا۔ جونہی وہ بیلجیم کے تخت پر بیٹھا جنگ چھڑ گئی چنانچہ اسے فوجوں کی کمان سنبھالنی پڑی۔ اسے پنگورے میں ڈال کر میدان جنگ میں لے جایا جاتا تھا جہاں اس کے پنگورے کو دو درختوں کے ساتھ باندھ کر نرس کی تحویل میں دے دیا جاتا تھا۔ اس جنگ میں اس کی فوجوں کی فتح حاصل ہوئی تو اسے فاتح قرار دیا گیا۔ بعد میں اس نے ۴۸ سال تک (۱۱۹۰ء - ۱۱۴۲ء) حکومت کی۔

درِ سماعت پہ دستک

الطاف حسین

کبھی جو گھر سے نکلوں تو سماعت کے کھلے در پر
بہت سی دستکیں ابھریں
کچھ ان میں وہ ہیں جن کی دھمک سے دل لرزتا ہے
ذرا آؤ مرے ہمراہ تم بھی
کچھ ایسی دستکیں سن لو

(۱) یہ جوتا لائیے پالش کروں گا
اسے پل بھر میں چمکا دوں گا، میں شیشہ بنا دوں گا

(۲) جناب اخبار لے لیں
نیا اخبار ہے یہ، شام کا ہے
بڑی ہی چٹپٹی خبریں ہیں اس میں، کام کا ہے

(۳) ابے چھوٹے! ذرا گاڑی تو دیکھو
ابھی استاد اس کو دیکھتا ہوں
ذرا صاحب اٹھائیں اس کا بونٹ

(۴) ذرا سا دھیان سے دھاگہ سنبھالو
گرہ کاٹو، گرہ ڈالو بہت اچھا مرے مالک
صفائی سے کروں گا کام سارا

(۵) اٹھالے یہ ہتھوڑا یہ لوہا گرم ہے اب چوٹ بھی مار

ابے دم ہی نہیں کیا؟

نہیں کھایا ہے کیا کھانا بھی گھر میں

یہ لو..... استاد..... اب تو ٹھیک..... ہے نا

(۶) کیسے کیوں تو یوں بیٹھا ہے چپ چاپ

نہیں آواز کیوں تیری نکلتی صدا دے

خدا کے نام پر خیرات دے دو

یتیموں پر سخی کوئی کرم کر.....

(۷) سڑک کے سارے پتھر میں نے توڑے

بشیرا ان پہ قبضہ کر رہا ہے

میں ٹھیکدار سے اب کیا کہوں گا؟

☆

بھلا کیسی صدائیں ہیں

کبھی مدھم کبھی ہیں تیز تر

اترتی جا رہی ہیں دل کے اندر تک

وہیں پھر سوچ آتی ہے

ملائم پھول سے بچوں کے یہ ہاتھ

بھلا کس نے کیے ہیں کھردرے سے

کوئی ان پھول ہاتھوں میں قلم کیوں دے نہیں سکتا؟

قلم کیا چند نوٹوں کی دیہاڑی سے بھی

کمتر ہو گیا ہے.....؟؟؟

مستقبل کی تلاش

نسرین شاہین

بچوں کا سب سے بڑا مسئلہ :

سرکاری اعداد و شمار کے مطابق پاکستان میں شرح خواندگی 35 فیصد بتائی جاتی ہے لیکن درحقیقت شرح خواندگی صرف 26 فیصد ہے۔ یونیسکو کی ایک رپورٹ کے مطابق شرح خواندگی کے اعتبار سے پاکستان دنیا کے 79 ویں نمبر پر ہے۔ تعلیم سے محرومی بیماریوں کے بعد دنیا کے بچوں کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ دنیا بھر میں 50 فیصد سے زائد بچے پرائمری تعلیم سے بھی محروم رہتے ہیں۔

پاکستان میں ایسے بچوں کی تعداد لاکھوں میں نہیں کروڑوں میں ہے جو تعلیم حاصل کرنے کی خواہش کے باوجود اسکول کی شکل نہیں دیکھ پاتے۔ ملک کے 65 ملین بچوں میں سے پانچ کروڑ بچے اسکول میں تعلیم کے حصول سے محروم ہیں۔

ناخواندگی کی ایک وجہ غربت اور افلاس ہے۔ دیہی علاقوں اور شہروں میں کوئی زیادہ فرق نہیں کروڑوں افراد غربت کی انتہائی حد سے نیچے زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ یہ لوگ پیٹ بھر نہیں سکتے تو تعلیم کس طرح حاصل کرسکتے ہیں؟ مملکتِ خداداد میں لاکھوں خاندان ایسے ہیں جن کے پاس سر چھپانے کو چھت تک میسر نہیں، کروڑوں افراد کچی بستیوں میں رہتے ہیں جہاں بنیادی سہولتوں کا نام و نشان تک نہیں یہ تمام معاشی ناہمواریاں دور ہوئے بغیر تعلیم کا حصول ممکن نہیں۔

علم کی روشنی :

جہاں تک پاکستان سے ناخواندگی ختم کرنے کے مسئلہ کا تعلق ہے اس کے لئے چند سال قبل یہ تجویز پیش کی گئی تھی کہ کالجوں، یونیورسٹیوں، انجینئرنگ یونیورسٹیوں، میڈیکل کالجوں اور پولی ٹیکنک انسٹیٹیوٹ سے فارغ التحصیل ہونے والوں پر قانونی طور پر یہ پابندی عائد کردی جائے کہ جب تک یہ فارغ التحصیل طلبہ بچوں یا بچیوں کو پڑھنا لکھنا نہیں سکھائیں گے، انہیں ڈگری نہیں دی جائے گی۔ اگر اس تجویز پر چند برس قبل عمل درآمد شروع ہوجاتا تو آج شرح خواندگی میں خاطر خواہ اضافہ ممکن ہوجاتا۔ اسی طرح شہروں بلکہ دیہاتوں میں بھی خواندگی کی شرح بڑھانے میں مدد ملے گی اگر کسی بھی تعلیمی ادارے سے فارغ التحصیل ہونے والے افراد سے بچوں کو تعلیم دینے کا کام لیا جائے۔

ہمارے مذہب اسلام نے بچوں اور بچیوں کی تعلیم اور تربیت کا خاص حکم فرمایا ہے۔ مگر ہمارے وطن عزیز میں موجودہ صورتِ حال کسی بھی طرح تسلی بخش نہیں ہے۔ بچوں کی فلاح و بہبود کے لئے کام کرنا صرف یونیسیف کا کام نہیں ہے بلکہ معاشرے کے ہر فرد پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنے ملک کے ان معماروں کو علم کی روشنی سے منور کریں۔ کیونکہ یہ ہمارا اور ہمارے ملک کا مستقبل ہیں اور زندہ قومیں اپنے مستقبل کی حفاظت کرتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ملک کو امن و آشتی، محبت و رواداری کا گہوارہ بنادے تاکہ ہمارے بچوں کا مستقبل محفوظ ہوسکے، آمین۔

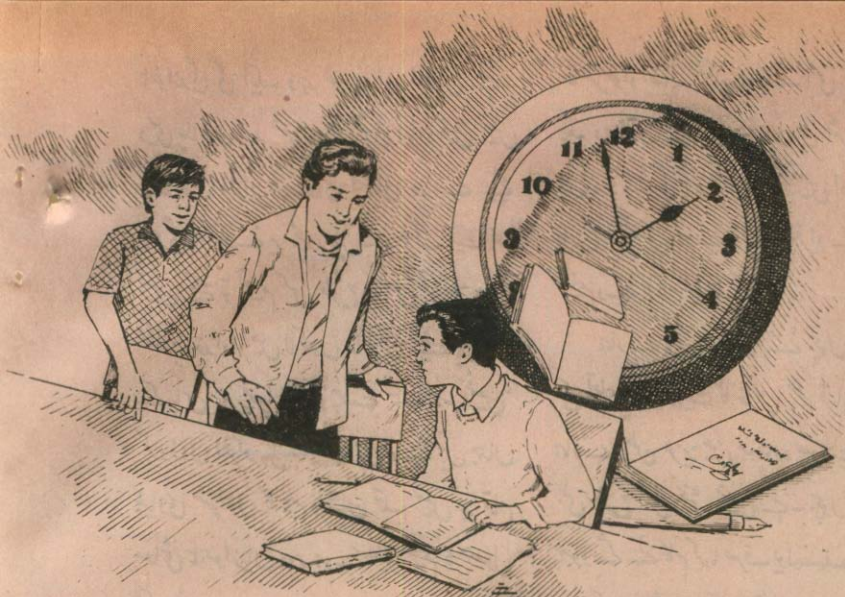

انکشاف

جدون ادیب

وقفے کی گھنٹی بجتے ہی سب نے تیزی سے اپنا اپنا سامان سمیٹا اور کلاس ٹیچر کے باہر نکلتے شور مچاتے باہر بھاگے۔

سہیل نے ایک نظر گھڑی پر ڈالی اور سب کے ساتھ وہ بھی اٹھ کر کلاس روم سے باہر نکل آیا۔ مگر اس کا رخ میدان یا ٹھیلے والے کی طرف نہ تھا بلکہ وہ ہمیشہ کی طرح آج بھی لائبریری کی طرف جارہا تھا۔ لائبریری میں اس وقت لائبریرین کے سوا کوئی نہ تھا' سہیل نے ایک کتاب نکلوائی اور سامنے رکھ کر نوٹس بنانے لگا! اس کو بیٹھے ابھی چند ہی لمحے گزرے ہوں گے کہ ایک آواز نے اسے چونکا دیا۔

"وہ دیکھو! کونے میں چھپا ہوا ہے!"

آواز سن کر سہیل نے قلم روک دیا اور نظریں اٹھائیں۔ سامنے مشتاق اور سفیر کھڑے مسکرا رہے تھے سہیل بھی مسکرا دیا۔

"یار تم بھی عجیب پاگل انسان ہو۔" مشتاق ناراض لہجے میں بولا۔

"پڑھے لکھے پاگل ایسے ہی تو ہوتے ہیں!" سفیر اس کے سامنے کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"کل بھی ہم نے تمہیں اتنے طویل لیکچر دیے کہ یہ آدم بیزاری ختم کرو۔ آج تم پھر یہ موٹی سی کتاب کھولے بیٹھے ہوئے ہو۔" مشتاق کا منہ بن گیا۔

"میں کیا کروں، تم کیا چاہتے ہو؟" سہیل نے قلم انگلیوں میں گھماتے ہوئے کہا۔

"ہمارے ساتھ تفریح میں حصہ لو، انجوائے کرو۔" سفیر مسکرا کر بولا۔

"مجھ سے یہ فضولیات نہیں ہوتیں۔" سہیل سنجیدگی سے بولا۔

"تم اس بور زندگی سے تنگ نہیں ہوتے؟" سفیر نے حیرت کا اظہار کیا۔

"یہی تو اصل زندگی ہے!" سہیل متانت سے بولا۔ "وقت کا ایک ایک لمحہ ہمارے لئے بہت قیمتی ہے۔ ہمیں آزاد ہوئے پچاس برس ہو چکے ہیں لیکن ترقی کا گراف بہت شرمناک ہے۔ ہم اپنا قیمتی وقت ضائع کر دیتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ہمارا وطن پیچھے ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ابھی ہمارے لئے موقع نہیں آیا کہ ہم کرسی پر بیٹھ کر احکامات صادر کیا کریں۔ ہمیں تو سخت محنت کرنا ہے۔ جب تک پاکستان غیر ملکی قرض کی لعنت سے آزاد نہیں ہو جاتا، آرام ہم پر حرام ہے۔ ہاں جب ہم قرضہ لینے کے بجائے دینے والے بن جائیں گے تو پھر وقت ہمارا ہو گا!"

"سارے پاکستان کی فکر بس تمہارے حصے میں آئی ہے۔" سفیر تمسخر سے ہنسا۔

"یہ میرا ہی نہیں ہر پاکستانی کا فرض ہے!" سہیل نے جواب دیا۔

"آخر پاکستان نے ہمیں دیا کیا ہے؟" مشتاق بے اختیار بولا۔

"یہی تو ساری بات ہے۔" سہیل کے لہجے میں دکھ تھا۔ "ہم یہ کہتے ہیں کہ ہمیں پاکستان نے کیا دیا ہے۔ یہ نہیں سوچتے کہ ہم نے پاکستان کو کیا دیا ہے۔"

"یہ تم ہی سوچو۔" سفیر بولا۔

"ہم تو یہ سوچ کر چلے آئے تھے کہ ہمارا دوست کہیں پڑھ پڑھ کر پاگل نہ ہو جائے۔" مشتاق نے ہمدردی جتائی۔

"میرے بارے میں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔" سہیل نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

سفیر کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "چلو یار چلیں کہیں اس کا وقت ضائع نہ ہو جائے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو سفیر! واقعی میرا وقت ضائع ہو رہا ہے۔" سہیل نے ان کے سامنے اپنا ہاتھ لاکر انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کو مسلتے ہوئے کہا۔ میں اپنا ایک ایک لمحہ کیلکولیٹ (Calculate) کرتا ہوں اس وقت بھی آپ سے فضول گفتگو پر جو وقت ضائع ہو رہا ہے۔ میں کیلکولیٹ کر رہا ہوں۔"

دونوں کچھ کہے بغیر ایک جھٹکے سے اٹھے اور دروازے کی طرف بڑھے' سفیر دروازے پر جاکر رکا اور مڑ کر بولا۔ "ایک وقت آئے گا جب تم اس بات کو ترسو گے کہ کوئی تمہارے ساتھ چند منٹ گزار لے۔"

مشتاق مڑا' چٹکی بجا کر اس کی طرف شہادت کی انگلی اٹھا کر بولا۔ "ہم بھی یہیں ہیں اور تم بھی' وقت فیصلہ کرے گا کہ کون صحیح تھا اور کون غلط!"

سہیل نے لاپروائی سے کندھے اچکائے اور کتاب کی طرف متوجہ ہو گیا!

☆ --- ☆ --- ☆

"کل سہیل اپنے محلے کے گراؤنڈ میں کرکٹ کھیلتا پایا گیا!" یہ اطلاع مشتاق نے سفیر کو دی۔

"سہیل اور کرکٹ؟ مذاق کر رہے ہو!!" سفیر کے لہجے میں حیرت تھی۔

"صحیح کہہ رہا ہوں۔" مشتاق بولا۔ "ایک کام سے سہیل کے محلے گیا تو وہاں اس کو دھواں دار بیٹنگ کرتے دیکھا۔ میں نے اس سے کہا کہ اب تمہارا وقت ضائع نہیں ہو رہا تو بولا" کھیل صحت کے لئے اچھا ہوتا ہے اور پاکستان کو صحت مند پاکستانیوں کی ضرورت ہے۔"

"پھر....!" سفیر بے اختیار بولا۔

"پھر کیا؟" مشتاق منہ بنا کر بولا۔ "کہنے لگا اب مجھے اجازت دو محلے کے بچوں کو ٹیوشن پڑھانا ہے....!"

"اونہہ!" سفیر نے ہنکارا بھرا۔

"مغرور!" مشتاق نے تبصرہ کیا اور سفیر اس کی تائید میں سر ہلانے لگا۔

☆ --- ☆ --- ☆

وقت آہستہ آہستہ آگے بڑھ گیا۔ میٹرک کرنے کے بعد تینوں کی راہیں جدا ہو گئیں۔ سہیل کے ابو کا دوسرے شہر میں ٹرانسفر ہو گیا اور وہ وہیں پڑھنے لگا' سفیر اور مشتاق نے ایک کالج میں داخلہ لے لیا۔ سہیل یہاں آکر بھی تنہا تھا اس کا کوئی دوست نہ بن سکا!

بس ایک گھڑی اس کی دوست تھی اور کتاب اس کی رفیق۔

تقریباً" بائیس برس کا طویل عرصہ بیت گیا....

☆ --- ☆ --- ☆

وہ نہایت ہی سنجیدگی اور متانت سے تقریر کر رہا تھا۔ اس کی یہ خاص عادت تھی کہ کہ وہ بہت مختصر تقریر کرتا تھا حالانکہ اس کو چاہنے والے بس اسی کو سننا چاہتے تھے!

اس بڑے آدمی کی زندگی انتھک محنت اور قوت ارادی سے بھرپور تھی۔ اس نے زمانہ طالب علمی سے ہی تعلیم کے فروغ کے لئے کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ غریب بچوں کو ٹیوشن پڑھانا ان کے لئے فیس و کتابوں کا بندوبست کرنا اور ایسے ہی کام کرتے کرتے اور محنت سے پڑھتے پڑھتے وہ ایک بڑا آفیسر بن گیا تھا مگر اسے سرکاری نوکری راس نہ آئی اور اس نے استعفیٰ دے کر تعلیم کے فروغ کے لئے خود کو وقف کر دیا۔ اس کی آواز میں اتنی سچائی تھی کہ ملک کے کونے کونے سے تعاون اور کام کرنے والے لوگ آگے بڑھے اور اس کے شانہ بشانہ کام کرنے لگے، علم کی شمعیں روشن ہونے لگیں اور یہ روشنی پھیلتی چلی گئی۔

پاکستان میں بلاشبہ اس نے خواندگی میں اضافے کے لئے بہت کام کیا تھا! اس نے اخبارات و جرائد میں تعلیم کی افادیت و اہمیت و ضرورت پر مختلف آرٹیکل اور فیچر لکھے، ویڈیو فلمیں بنا کر عوام میں تعلیم کا شعور بیدار کرنے کی کوشش کی!

پھر اس کی محنت سے وہ وقت بھی آگیا جب تعلیم کی اہمیت سب پر آشکار ہوتی چلی گئی۔ سب کو یہ احساس بھی ہو گیا کہ دنیا میں انسانوں کے روپ میں فرشتے بھی ہوتے ہیں۔ اس کی کوشش کو نہ صرف ملکی بلکہ عالمی سطح پر سراہا جانے لگا۔

اپنی تقریر ختم کر کے جیسے ہی وہ اسٹیج سے اترا اس کے گرد ایک ہجوم سا جمع ہو گیا، سب اس کے ساتھ چند لمحے بات کرنے اور آٹوگراف لینے کے خواہاں تھے۔

ہوٹل کے منتظمین نے اس کے قیمتی وقت کے پیش نظر اسے سب سے بچا کر پچھلے گیٹ سے باہر نکال دیا۔ اس کے قدم پارکنگ کی طرف اٹھ رہے تھے کہ ایک نوجوان نے اس کا راستہ روک لیا!

"سر! پلیز!" کہتے کہتے اس نے ایک آٹوگراف بک اور قلم اس کی طرف بڑھا دیا!

اس نے تیزی سے آٹوگراف بک پر دستخط کئے، نوجوان کو پیار سے تھپتھپایا اور مسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

"سر! میں آپ کی بہت عزت کرتا ہوں۔ آپ میری آئیڈیل شخصیت ہیں۔" نوجوان نے بے

ساختہ اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "مجھے آپ سے ملنے اور بات کرنے کا بہت اشتیاق تھا۔" "مجھے بھی تم نوجوانوں سے بہت امیدیں ہیں۔" اس نے رک کر کہا تو نوجوان کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوگئی۔ وہ اس کے جانے کے بعد بھی اس کے راستے پر آنکھیں جمائے کھڑا رہا۔ آواز سن کر مڑا تو سامنے دو آدمی کھڑے تھے!

"سہیل کہاں ہے کیا وہ اندر موجود ہے؟" ایک نے اس سے سوال کیا یہ سفیر تھا.....

"نہیں وہ تو جا چکے....." نوجوان کو سفیر کا سہیل صاحب کو یوں پکارنا اچھا نہ لگا۔

"کک... کیوں.....!" مشتاق کے منہ سے نکلا

"کیونکہ ان کا وقت بہت قیمتی تھا!" نوجوان نے گویا کہ انکشاف کیا۔

دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر بیک وقت دونوں کے ہاتھ کھل گئے' ان کے ہاتھوں سے آٹوگراف بکس نیچے گر پڑی تھیں......

آج وہ ایک دفعہ پھر ہار گئے تھے اور وقت.... جیت چکا تھا!!!

●●●

روشنی اے روشنی

جاپان دنیا کا واحد ملک ہے جو ایٹم بم کی تباہ کاریوں سے دوچار ہوا۔ دوسری جنگ عظیم نے جاپان کو مکمل طور پر تباہ و برباد کردیا تھا لیکن 50 سال کے عرصے میں جاپان نے ترقی کے میدان میں ایسے ایسے کارہائے نمایاں انجام دیئے کہ باقی دنیا کو پیچھے چھوڑ دیا' اس کی ایک مثال یہ ہے کہ سنہ 1920ء کی دھائی میں جاپان میں شیر خوار بچوں کی شرح اموات کا تناسب ایک ہزار پر 145 تھا آج یہ تناسب بمشکل 5 فیصد رہ گیا ہے۔ اسی طرح سے تعلیم کے میدان میں بھی جاپان بہت آگے نہیں تھا لیکن آج جاپان میں شرح خواندگی 100 فیصد ہے۔ 47 فیصد بچیاں ہائی اسکول تک تعلیم حاصل کرتی ہیں۔ کوریا میں 90 فیصد بچے تعلیم حاصل کرتے ہیں۔

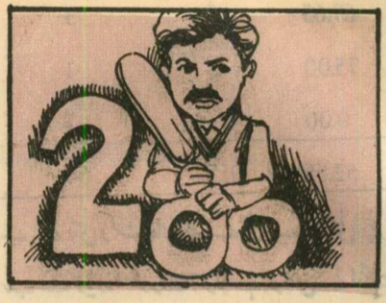

پاکستانی کرکٹ

عمران خالق

پاکستان کو بنے تقریباً پچاس سال ہوگئے ہیں لیکن پاکستانی کرکٹ کی تاریخ پچاس سالوں پر محیط نہیں ہے۔ پاکستان کو سنہ 1952ء میں ٹیسٹ کرکٹ کھیلنے کا درجہ ملا۔ پاکستان نے اپنا پہلا ٹیسٹ میچ سنہ 1952ء میں بھارت کے خلاف بھارت کے شہر دہلی میں کھیلا جہاں اسے ایک اننگ اور 70 رن سے شکست کا سامنا کرنا پڑا جو کہ ایک اچھی کارکردگی نہ تھی لیکن اس کے بعد پاکستانی ٹیم کی کارکردگی بتدریج بہتر ہوتی چلی گئی اور آج اس کا شمار دنیا کی چند بہترین ٹیموں میں ہونے لگا ہے۔ پاکستان کے اب تک کے کھیلے گئے ٹیسٹ میچز کے ریکارڈز اور مختلف ٹیموں کے خلاف اس کی کارکردگی کیا رہی ہے، آیئے دیکھتے ہیں۔

ملک	میچز	جیتے	ہارے	ڈرا	فتح کا تناسب
انگلینڈ	55	9	14	32	45.45
آسٹریلیا	40	11	14	15	46.25
ویسٹ انڈیز	31	7	12	12	41.94

نیوزی لینڈ	39	18	5	16	66.66
بھارت	44	7	4	33	53.41
سری لنکا	17	9	3	5	67.65
زمبابوے	8	5	1	2	75.00
جنوبی افریقہ	1	–	1	-	0.00
مجموعی کارکردگی	235	66	54	115	52.55

پاکستان کی جانب سے ٹیسٹ میچز میں سب سے پہلی وکٹ خان محمد نے لی جب کہ پہلی سنچری نذر محمد نے بنائی۔ ٹیسٹ میچز میں پاکستان کا سب سے زیادہ اسکور 708 رنز ہے جو اس نے انگلینڈ کے خلاف انگلینڈ ہی میں سنہ 1987ء میں بنایا' ٹیسٹ میچز میں پاکستان کی جانب سے سب سے لمبی اننگ حنیف محمد نے ویسٹ انڈیز کے خلاف 337 رنز کی کھیلی ہے جو 970 منٹ میں مکمل ہوئی جو بلحاظ وقت ٹیسٹ کرکٹ کی طویل ترین اننگز ہے۔ جبکہ بالنگ میں کسی ایک اننگ کی بہترین کارکردگی عبدالقادر کی رہی ہے جنہوں نے انگلینڈ کے خلاف 56 رنز دے کر 9 کھلاڑیوں کو آؤٹ کیا اور پورے میچ میں بہترین کارکردگی عمران خان کی رہی ہے جنہوں نے سری لنکا کے خلاف لاہور میں 116 رن دے کر 14 کھلاڑیوں کو آؤٹ کیا۔ پاکستان کی جانب سے سب سے زیادہ ٹیسٹ میچز کھیلنے کا اعزاز جاوید میانداد کو حاصل ہے۔ جنہوں نے 124 ٹیسٹ میچز میں حصہ لیا ہے۔ سب سے زیادہ رن بھی 8832 رن 52.57 کی اوسط سے جاوید میانداد نے ہی بنائے ہیں جبکہ سب سے زیادہ سنچریاں 23' ڈبل سنچریاں 6 اور نصف سنچریاں 43 بھی جاوید میانداد نے ہی بنائی ہیں اس کے علاوہ سب سے زیادہ کیچز بھی جاوید میانداد نے پکڑے ہیں جن کی تعداد 93 ہے۔ سب سے زیادہ وکٹیں لینے کا اعزاز عمران خان کو حاصل ہے۔ جنہوں نے 88 ٹیسٹ میچز میں 22.81 کی اوسط سے 362 وکٹیں لی ہیں۔ پاکستان کی تاریخ کے سب سے کامیاب وکٹ کیپر وسیم باری رہے ہیں۔ جنہوں نے 81 ٹیسٹ میچز میں 201 کیچز اور 27 اسٹمپکر سمیت 228 شکار کئے ہیں۔

ون ڈے انٹرنیشنل میچز میں پاکستان نے اپنا پہلا میچ 11 فروری سنہ 1992ء کو نیوزی لینڈ کے شہر کرائسٹ چرچ میں کھیلا جہاں اسے 22 رنز سے شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن اس کے بعد سے

پاکستان کی کارکردگی نیوزی لینڈ کے خلاف ہمیشہ اچھی رہی ہے۔ پاکستان ون ڈے کرکٹ کے سب سے بڑے ٹورنامنٹ ورلڈ کپ میں ایک بار سنہ 1992ء میں کامیابی حاصل کرچکا ہے جہاں اس نے آسٹریلیا کے شہر میلبورن میں عمران خان کی قیادت میں انگلینڈ کو فائنل میں ہرایا تھا۔ پاکستان کے جاوید میانداد کو ورلڈ کپ میں سب سے زیادہ 43.32 کی اوسط سے 1083 رن بنانے کے علاوہ اب تک کے کھیلے گئے چھ کے چھ ورلڈ کپ میں شرکت کرنے کا منفرد اعزاز بھی حاصل ہے۔ پاکستان کے اب تک کے کھیلے گئے ون ڈے میچز کے ریکارڈز اور مختلف ممالک کے خلاف اس کی کارکردگی درج ذیل ہے۔

ملک	میچز کھیلے	جیتے	ہارے	ٹائی ہوئے	فیصلہ نہ ہوسکا	فتح کا تناسب
انگلینڈ	40	14	25	-	1	36.25
آسٹریلیا	46	21	22	1	2	48.91
بھارت	50	32	16	-	2	66.00
نیوزی لینڈ	47	28	17	1	1	61.70
سری لنکا	59	43	15	-	1	73.72
ویسٹ انڈیز	81	25	54	2	-	43.75
جنوبی افریقہ	16	7	9	-	-	32.09
زمبابوے	12	10	1	1	-	91.66
بنگلہ دیش	3	3	-	-	-	100.00
یو-اے-ای	2	2	-	-	-	100.00
کینیڈا	1	1	-	-	-	100.00
ہالینڈ	1	1	-	-	-	100.00
کینیا	1	1	-	-	-	100.00
مجموعی کارکردگی	359	188	159	5	7	54.03

ون ڈے میچز میں پاکستان کی جانب سے سب سے پہلی وکٹ سرفراز نواز نے لی جب کے پہلی سنچری ماجد خان نے بنائی ہے۔ ون ڈے میچز میں پاکستان کا سب سے زیادہ اسکور 371 رن ہے جو اس نے سری لنکا کے خلاف 14 اکتوبر سنہ 1996ء کو کینیا میں بنایا۔ ون ڈے میچز میں پاکستان کی جانب سے سب سے لمبی اننگ انضمام الحق نے کھیلی ہے۔ جنہوں نے سنہ 1993ء میں شارجہ میں نیوزی لینڈ کے خلاف 137 رن بنائے تھے جبکہ بالنگ میں کسی میچ میں سب سے بہترین کارکردگی عاقب جاوید کی رہی ہے جنہوں نے 37 رن دے کر 7 وکٹیں بھارت کی ٹیم کے خلاف 25 اکتوبر سنہ 1993ء کو شارجہ میں لی تھیں۔ جو کہ ایک ورلڈ ریکارڈ بھی ہے۔ اپنی اس کارکردگی کے دوران انہوں نے روی شاستری، سچن ٹنڈولکر اور اظہرالدین کو تین مسلسل گیندوں پر آؤٹ کر کے ہیٹ ٹرک بھی بنائی تھی۔ پاکستان کی جانب سے سب سے زیادہ میچز سلیم ملک نے کھیلے ہیں جن کے میچز کی تعداد 248 ہے جبکہ سب سے زیادہ رن جاوید میانداد نے بنائے ہیں۔ جنہوں نے 41.70 کی اوسط سے 7381 رن بنائے جبکہ سب سے زیادہ 11 سنچریاں سعید انور نے بنائی ہیں۔ سب سے زیادہ نصف سنچریاں جاوید میانداد نے بنائی ہیں جن کی تعداد 50 ہے جو کہ دنیا میں ویسٹ انڈیز کے ڈیسمنڈ ہینز کے بعد دوسرے نمبر پر ہیں۔ سب سے زیادہ کیچز سلیم ملک نے لئے ہیں جن کے کیچز کی تعداد 72 ہے اس کے علاوہ سب سے زیادہ وکٹیں وسیم اکرم نے لی ہیں۔ جنہوں نے 223 میچز کھیل کر 321 وکٹیں حاصل کرلی ہیں جو کہ ایک ورلڈ ریکارڈ ہے۔ وسیم اکرم دونوں طرح کی کرکٹ میں 300 وکٹیں لینے والے واحد بالر ہیں۔ وکٹ کیپنگ کے شعبے میں سب سے زیادہ شکار کسی ایک وکٹ کیپر کے نہیں ہیں بلکہ یہ تین وکٹ کیپر راشد لطیف، سلیم یوسف اور معین خان تینوں کے برابر ہیں تینوں نے 103 شکار کئے ہیں۔

۔ آج کی پاکستانی کرکٹ ٹیم نوجوان کھلاڑیوں پر مشتمل ہے اور اس میں ٹیم اسپرٹ بھی موجود ہے سو ہمیں امید ہے کہ پاکستان (انشاء اللہ) اپنی کارکردگی کو خوب سے خوب تر کرتا چلا جائے گا اور اپنے اس ریکارڈ کو مزید بہتر کرے گا۔ ●

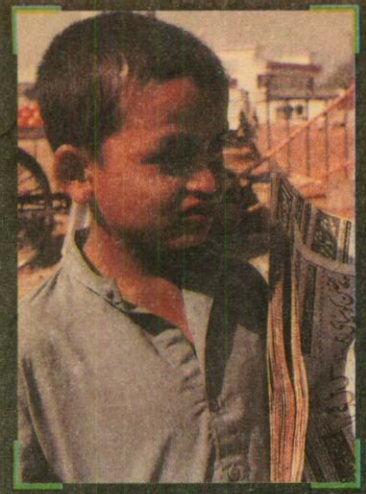

کمسن مزدور کتنے مجبور

دکھوں کے البم سے ایک ورق

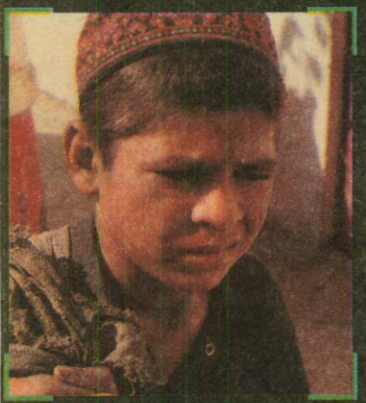

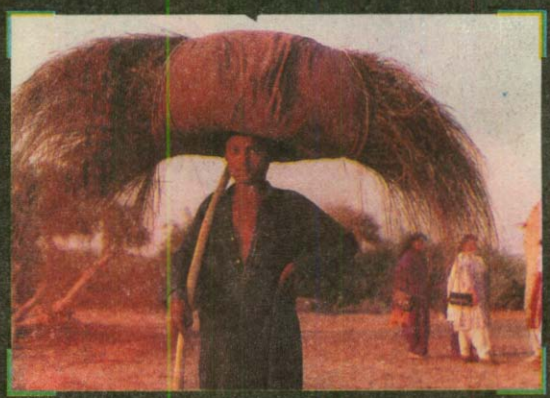

نئی صدی کے استقبال کی تیاریاں

نیا فن، نیا آہنگ
نئی رُت نیا عزم

وطن کی خاطر

اخلاق احمد

''حق اسکواڈ'' والوں کو اندازہ بھی نہیں تھا کہ ایک دن پولیس انہیں گھیر لے گی.....!

وہ چاروں تو اپنے ''ہیڈکوارٹر'' میں بیٹھے پڑھائی کررہے تھے۔ ''ہیڈکوارٹر'' وہ اس غار کو کہتے تھے جہاں انہوں نے مل کر بیٹھنے کے لئے جگہ بنا رکھی تھی۔ یہاں وہ پڑھائی کرتے تھے۔ چائے پیتے تھے۔ باتیں کرتے تھے اور بدی کے خلاف جنگ کی منصوبہ بندی کرتے تھے۔

تو اس دن بھی وہ چاروں .... شہریار' سرفراز' ضیاء اور شہزاد .... وہاں اطمینان سے بیٹھے پڑھائی کررہے تھے۔ امتحان جوں جوں قریب آتے جاتے تھے' ان کی تیاری تیز ہوتی جاتی تھی۔

سرفراز کسی کام سے اٹھ کر باہر گیا اور ذرا سی دیر بعد گھبراہٹ کے عالم میں' تیزی سے اندر گھسا۔

''شہریار ....'' اس نے چلا کر کہا۔ ''مارے گئے۔ پولیس کی ایک گاڑی باہر آکر رکی ہے اور اس میں سے سپاہی کُود کُود کر اتر رہے ہیں۔''

ضیاء نے حیرت سے اسے دیکھا اور بولا۔ ''اسے ٹھنڈا پانی پلاؤ یار۔ اس کے دماغ پر گرمی کا اثر ہوگیا ہے۔''

شہزاد ہنسا۔ "بلکہ اس کے سر کو ٹھنڈے پانی کی بالٹی میں غوطہ دو۔"

"یار میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔" سرفراز نے تیز آواز میں کہا۔ "خدا کی قسم، باہر پولیس کی گاڑی آکر رکی ہے۔"

ضیاء اٹھا اور غار کے دروازے کی طرف بڑھا۔ اس نے باہر جھانک کر دیکھا اور پلٹ کر بولا۔ "سرفراز ٹھیک کہہ رہا ہے۔ پانچ چھ سپاہی جن کے ہاتھوں میں بندوقیں ہیں اور ایک شاید انسپکٹر ہے۔ وہ .... وہ ہمارے غار کی طرف ہی آرہے ہیں۔!"

سرفراز بولا۔ "جل تو جلال تو۔ آئی بلا کو ٹال تو۔ یار شہریار..... میں تمہیں کتنا منع کرتا تھا کہ الٹے سیدھے کاموں میں ٹانگ مت اڑاؤ۔ مگر تمہارے دماغ پر تو "حق اسکواڈ" کا بھوت چڑھا ہوا تھا۔ برائی سے جنگ کرنے کا شوق تھا.... اور کرو جنگ۔ اب آگئی ہے پولیس تمہیں گرفتار کرنے۔"

شہریار نے کہا۔ "کیا بکواس کئے جارہے ہو۔"

"یہ بکواس نہیں ہے بیٹے۔" سرفراز نے کہا۔ "ابھی پولیس ہتھکڑیاں لگا کر لے جائے گی۔ بندوقیں لے کر آئے ہیں وہ ..... جانتے ہو نا بندوقیں کیا ہوتی ہیں؟ گولیاں ماری جاتی ہیں۔ ان سے .... خود بھی پھنسے ہو اور ہمیں بھی مروا دیا ہے ..... پہلے وہ تھانے لے جائیں گے۔ پھر جیل جانا ہوگا۔ اخباروں میں تصویریں چھپیں گی۔ سارے شہر کو پتہ چل جائے گا۔ یا خدا ..... میں کہاں پھنس گیا ہوں....."

اسی وقت پولیس کی وردی میں ملبوس ایک انسپکٹر نے غار کے اندر قدم رکھا۔

غار میں سناٹا چھا گیا۔

"تم لوگوں میں سے شہریار کون ہے.....؟" انسپکٹر نے اپنی گرجدار آواز میں پوچھا۔

شہریار ایک قدم آگے بڑھا اور بولا "جی میں ہوں شہریار۔"

انسپکٹر نے غور سے اس نوعمر لڑکے کو دیکھا جو پوری جرأت اور بے خوفی کے ساتھ اس کے سامنے آکھڑا ہوا تھا۔

اس کے بعد وہ ہوا، جس کی حق اسکواڈ کے کسی رکن کو توقع ہی نہیں تھی۔

انسپکٹر کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس نے آگے بڑھ کر شہریار سے ہاتھ ملایا اور بولا۔ "بھئی بہت مشکل سے تمہارا یہ "ہیڈ کوارٹر" ملا ہے۔ آدھے گھنٹے سے ہم اسے ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ میرا نام انسپکٹر سہیل ہے۔ انسپکٹر سہیل انوار اور میں تمہارے "حق

اسکواڈ" سے ملنے کے لئے خاص طور پر آیا ہوں۔"

ذرا سی دیر میں غار کے اندر منظر بدل گیا۔ حق اسکواڈ والوں کے چہروں پر مسکراہٹ آگئی۔ باری باری سب نے انسپکٹر سہیل سے ہاتھ ملائے اور اپنا اپنا تعارف کرایا۔ انسپکٹر ان کے ساتھ ہی دری پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

انہوں نے انسپکٹر کے لئے چائے بنائی۔ ضیاء نے چولہا جلایا۔ شہریار نے کیتلی میں پانی بھر کر رکھا۔ شہزاد نے چائے بنا کر ایک ایک مگ سب کے سامنے رکھ دیا۔ انسپکٹر سہیل دلچسپی سے انہیں یہ کام کرتے دیکھتا رہا۔

باتوں باتوں میں ضیاء نے کہا۔ "انسپکٹر صاحب.... ہم لوگ تو ڈر گئے تھے کہ پولیس نے ہمیں کیوں گھیر لیا ہے؟"

شہریار بولا۔ "بلکہ سرفراز تو ڈر کے مارے تھر تھر کانپنے لگا تھا۔"

"خیر۔" سرفراز نے کہا۔ "ایسی بات بھی نہیں ہے البتہ میں یہاں سے فرار ہونے کے بارے میں ضرور سوچ رہا تھا۔"

انسپکٹر سہیل ہنسا۔ "کیا کریں بھئی، ہم پولیس والے بدنام بہت ہیں۔ لوگ ہم سے خواہ مخواہ ڈر جاتے ہیں۔ جس نے کوئی جرم نہ کیا ہو، اسے تو پولیس سے ڈرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ پولیس آپ کو نقصان پہنچانے کے لئے نہیں، آپ کی حفاظت کرنے کے لئے ہوتی ہے۔"

شہزاد مسکرایا۔ "انسپکٹر صاحب۔" اس نے کہا۔ "کاش! آپ یہ بات باقی پولیس والوں کو بھی سمجھا سکتے۔!"

اس بات پر سب ہی ہنس پڑے۔

انسپکٹر سہیل نے کہا۔ "خیر! یہ تو مذاق کی باتیں تھیں۔ اب میں کام کی طرف آتا ہوں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ مجھے امید ہے، میں تم لوگوں سے جو بھی کہوں گا، اسے تم لوگ راز میں رکھو گے۔ کسی سے اس کا ذکر نہیں کرو گے۔"

سرفراز بولا۔ "کیسی باتیں کر رہے ہیں انسپکٹر صاحب۔ ہم نو عمر ضرور ہیں مگر بے وقوف نہیں ہیں۔"

"یہ بات نہیں ہے۔" انسپکٹر نے کہا۔ "میں جو بات تمہیں بتانا چاہتا ہوں وہ بہت اہم نوعیت کی ہے۔ اس لئے کہ اس کا تعلق ہمارے ملک پاکستان سے ہے۔ بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن کی خاطر آدمی کو بہت کچھ قربان کرنے کے لئے تیار رہنا پڑتا ہے۔ جیسے مذہب کی خاطر آدمی ہر قربانی دینے کے لئے تیار رہتا ہے۔ اسی طرح

آدمی کو اپنے وطن کے لئے بھی ایک خاص جذبہ رکھنا پڑتا ہے۔ پھر ہم تو اس ملک کے شہری ہیں جو صرف اور صرف اسلام کے نام پر بنا تھا۔ سمجھ رہے ہو نا تم لوگ؟"

شہریار نے کہا۔ "انسپکٹر صاحب بے فکر رہیے۔ اس پاکستان کے لئے تو ہم جان بھی قربان کر سکتے ہیں۔ آپ ہمیں جو بات بھی بتائیں گے، وہ زندگی بھر ہمارے سینوں میں محفوظ رہے گی۔ آپ کا راز، راز ہی رہے گا۔"

انسپکٹر سہیل نے کہا۔ "مجھے تم لوگوں سے یہی امید ہے۔ اس سے پہلے بھی ایک دو بار تم لوگ مجرموں کو گرفتار کرانے میں پولیس کی مدد کر چکے ہو۔ اب ہمیں ایک بار پھر تم لوگوں کی مدد کی ضرورت ہے۔"

ضیاء بولا۔ "انسپکٹر صاحب ایسا کون سا معاملہ ہے جس میں پولیس ہم جیسے کم عمر لڑکوں کی مدد لینے پر مجبور ہو گئی ہے؟"

انسپکٹر سہیل نے کہا۔ "میں وہی بتانا چاہتا ہوں۔ دراصل ایک آدمی ہے سیٹھ کبیرداس۔ تم لوگوں کے اسکول سے ذرا آگے اس کی بہت بڑی کوٹھی ہے۔ ہمیں سیٹھ کبیرداس پر شبہ ہے کہ وہ ایک دشمن ملک کے لئے کام کرتا ہے۔ ہمیں شبہ ہے کہ وہ دشمنوں کا ساتھی ہے اور ہمارے ملک کے خلاف کام کرتا ہے۔ ایک اطلاع یہ بھی ملی ہے کہ شاید اس کی کوٹھی کے کسی حصے میں یا کسی خفیہ تہہ خانے میں بہت سا اسلحہ اور گولہ بارود چھپایا گیا ہے۔ جو ہمارے ملک کے مختلف حصوں میں دھماکے کرنے اور لوگوں کو ہلاک کرنے کے کام آتا ہے۔"

"یہ تو بہت آسان معاملہ ہوا۔" شہزاد نے کہا۔ "آپ اپنے سپاہیوں کے ساتھ سیٹھ کبیرداس کی کوٹھی پر چھاپہ ماریں۔ سارا گولہ بارود اور اسلحہ پکڑ لیں۔ مجرموں کو بھی پکڑ لیں۔"

"یہ آسان بات نہیں ہے۔" انسپکٹر سہیل نے کہا۔ "سیٹھ کبیرداس بہت دولت مند اور بہت اثر و رسوخ والا آدمی ہے۔ اگر ہم نے وہاں چھاپہ مارا اور وہاں کچھ بھی نہ ملا۔ نہ گولہ بارود، نہ سیٹھ کبیرداس کے کسی جرم کا ثبوت، تو بڑی گڑبڑ ہو جائے گی۔ وہ الٹا ہم پولیس والوں پر مقدمہ کر دے گا۔ اخبارات میں خبریں چھپ جائیں گی۔ ہنگامہ مچ جائے گا کہ پولیس نے ایک شریف اور معزز آدمی کے گھر پر خواہ مخواہ چھاپہ مار دیا۔ اس بات پر اتنا شور مچ سکتا ہے کہ ہو سکتا ہے مجھے نوکری سے نکال دیا جائے۔"

"بات تو ٹھیک ہے آپ کی۔" شہریار نے کہا۔ بغیر ثبوت حاصل کئے کسی کے گھر پر چھاپہ

مارنا تو نقصان دہ بھی ہو سکتا ہے۔ آپ کی کوشش ناکام رہی تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دشمن ہوشیار ہو جائے۔"

انسپکٹر سہیل مسکرایا۔ "ہاں اور ہم یہ نہیں چاہتے کہ دشمن ہوشیار ہو جائے۔ ہم اس کی نگرانی تو کر رہے ہیں۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ نگرانی کرنے والے خود ہماری پولیس کے سپاہی ہیں۔ وہ مختلف بھیس بدل کر کوٹھی کے اردگرد پھرتے رہتے ہیں لیکن انہیں پہچان لینا بہت آسان ہے۔ اس لئے ہم نگرانی کے کام میں تم لوگوں کی مدد لینا چاہتے ہیں۔"

"ہائیں۔!" سرفراز نے کہا۔ "یہ میں کیا سن رہا ہوں؟" حق اسکواڈ کے بہادر ارکان کو اب نگرانی جیسا معمولی کام کرنا پڑے گا؟"

انسپکٹر سہیل نے ہنس کر کہا۔ "یہ معمولی کام نہیں ہے نوجوان۔ بے حد اہم اور مشکل کام ہے۔ تمہیں سیٹھ کبیر داس کی کوٹھی کے اندر آنے جانے والے ہر آدمی پر نظر رکھنی ہے۔ تم لوگ وہاں بھیس بدل کر سڑک پر دو کانوں کے درمیان مختلف کاموں میں مصروف بھی رہو گے اور ساتھ ہی نگرانی بھی کرتے رہو گے۔ تم میں سے دو لڑکوں کو چھوٹے چھوٹے کیمرے دیئے جائیں گے جن سے تم کوٹھی کے اندر آنے جانے والوں کی تصویریں اتارتے رہو گے۔ اگر کوئی گاڑی کوئی سامان اندر جائے گا تو اس کی بھی تصویریں کھینچو گے۔ سڑک کے آخری سرے پر ایک چھوٹی سفید کار ہر وقت کھڑی رہے گی۔ وہ پولیس کی کار ہو گی۔ اس میں ایک ڈرائیور ہر وقت تیار بیٹھا رہے گا۔ اگر سیٹھ کبیر داس اپنی گاڑی میں کہیں جائے گا تو تم میں سے ایک یا دو لڑکے اس کار میں سوار ہو کر اس کا احتیاط سے پیچھا کریں گے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمیں کسی طرح سیٹھ کبیر داس کے خلاف کوئی سراغ مل جائے۔ کوئی اشارہ مل جائے کہ وہ جرائم میں ملوث ہے۔ بس پھر ہم اس پر ہاتھ ڈال دیں گے۔"

شہریار بولا۔ "اور اگر مسلسل کئی دن تک نگرانی کرنے کے باوجود کوئی اشارہ نہ ملا تو کیا ہو گا؟"

"کوشش کرنا ہمارا فرض ہے۔" انسپکٹر نے کہا۔ "کامیابی اس کو ملتی ہے جو کوشش کرتا ہے۔ ہم بھی اپنی کوششیں جاری رکھیں گے۔ آج نہیں تو کل، ایک نہ ایک دن مجرم ضرور پکڑا جائے گا۔ اب میں تم لوگوں کو بتا دیتا ہوں کہ تمہیں کس طرح کام کرنا ہے۔"

انسپکٹر سہیل اس کے بعد دیر تک ان سے سرگوشی میں باتیں کرتا رہا۔

وہ چاروں سنتے رہے۔

رفتہ رفتہ حق اسکواڈ کے چاروں ارکان کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ان کے چہرے دمکنے لگے۔ ان کے ہونٹوں پر وہ مسکراہٹ آگئی جو وطن کی خاطر کام کرنے والوں کے ہونٹوں پر ہوتی ہے۔

کچھ ہی دیر بعد انسپکٹر سہیل ان سے ہاتھ ملا کر رخصت ہوگیا۔

☆ --- ☆ --- ☆

سیٹھ کبیرداس کی کوٹھی کے باہر ایک مصروف سڑک تھی جس پر ٹریفک کا ہر وقت ہجوم رہتا تھا۔ سڑک کے اس پار کئی دوکانیں تھیں جہاں سینکڑوں خریدار ہر وقت موجود رہتے تھے۔ کسی کو پتا نہ چلا کہ وہاں چار لڑکے خاموشی سے مختلف کاموں میں مصروف ہوگئے ہیں۔

شہریار .... ایک فقیر بنا ہوا تھا۔ اس کے کپڑے میلے کچیلے اور پھٹے ہوئے تھے اور چہرے پر جگہ جگہ کالک لگی ہوئی تھی۔ وہ لنگڑا کر چل رہا تھا اور آواز لگاتا جارہا تھا۔ "دے جا سخی داتا۔ اللہ کے نام پر۔ دے جا غریب فقیر کو۔ اللہ کے نام پر۔"

سرفراز ایک دوکان کے سامنے کونے پر جوتے پالش کرنے کا سامان لے کر بیٹھا ہوا تھا۔ پالش کی ڈبیاں اور برش اور جوتے چمکانے والے کپڑے اور چپلیں، مرمت کرنے کا سامان۔

شہزاد .... چھولے بیچ رہا تھا۔ ایک چھوٹے سے خوانچے پر اس نے ایک تھال میں چھولے ڈھیر کی صورت میں رکھے ہوئے تھے۔ چھوٹے چھوٹے مرتبانوں میں کھٹائی، چٹنی، نمک اور پاپڑی رکھی ہوئی تھی۔ وہ آوازیں لگا رہا تھا۔ "چھولے مصالحے والے، لے لو۔ چھولے مصالحے والے۔"

ضیاء .... بچوں کے کھلونے بیچ رہا تھا۔ ایک ٹھیلے پر اس کے سامنے پلاسٹک کے چھوٹے چھوٹے بے شمار کھلونے ڈھیر تھے۔ بطخیں اور بندوقیں اور طوطے اور گیندیں۔ "دو روپیہ ہر مال۔ دو روپیہ ہر مال۔" وہ چیخ چیخ کر اعلان کر رہا تھا۔

وہ چاروں بظاہر اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ مگر ان کی نظریں سامنے سیٹھ کبیرداس کی کوٹھی کے سیاہ گیٹ پر تھیں۔ صبح سے دوپہر ہوگئی تھی۔

صرف ایک آدمی کوٹھی سے باہر نکلا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ٹوکری تھی اور یوں لگتا تھا جیسے وہ کوٹھی میں کام کرنے والا کوئی نوکر ہو۔ شہریار نے، جو فقیر بنا ہوا تھا، خاموشی سے اس آدمی کا پیچھا کیا تھا۔ مگر وہ آدمی سڑک پار کرکے بازار کی طرف آنے کے بعد سیدھا ایک سبزی کی دوکان

پر گیا تھا اور کئی طرح کی سبزیاں خرید کر، دوکاندار کو پیسے دے کر، واپس کوٹھی میں چلا گیا تھا۔

دوپہر کے وقت شہریار لنگڑاتا ہوا آہستہ آہستہ سرفراز کے پاس پہنچا جو ایک گاہک کے جوتے پالش کرنے کے بعد اب فارغ بیٹھا تھا۔

"معاف کرو بابا۔" سرفراز نے کہا۔ "شرم نہیں آتی بھیک مانگتے ہوئے۔"

"آتی ہے۔" شہریار نے آہستہ سے کہا۔ "اور جب آتی ہے تو میں شرمانے لگتا ہوں۔ بھائی سرفراز صبح سے اب تک ساڑھے آٹھ روپے بھیک میں مل چکے ہیں۔"

سرفراز بولا۔ "چھ گاہکوں نے مجھ سے جوتے پالش کرائے ہیں۔ مجھے بارہ روپے مل چکے ہیں ادھر شہزاد تو دھڑا دھڑ چھولے بیچ رہا ہے۔ میرا خیال ہے پچاس روپے کما چکا ہوگا۔ یار شہریار .....ہم لوگ یہی کام نہ شروع کردیں؟ پڑھائی میں کیا رکھا ہے۔"

"بکواس بند کرو۔" شہریار بولا۔ "میں دو دفعہ سیٹھ کبیرداس کی کوٹھی کے گیٹ کے سامنے سے اللہ کے نام پر کی آوازیں لگاتا ہوا گزر چکا ہوں مگر گیٹ بالکل بند ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کیا جائے؟ خیر! میں ایک دفعہ پھر کوشش کرتا ہوں۔"

سرفراز اسی وقت لنگڑاتا ہوا واپس چل پڑا۔

کچھ دیر بعد اس نے سڑک پار کی اور سیٹھ کبیرداس کی کوٹھی کی طرف چلنے لگا۔

گیٹ کے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے پھر آوازیں لگانی شروع کیں۔ "دے جا سخی داتا۔ اللہ کے نام پر۔ دے جا غریب فقیر کو۔ اللہ کے نام پر۔"

گیٹ بند تھا۔

شہریار نے گزرتے گزرتے پھر آواز لگائی اور پھر رک کر گیٹ میں سے اندر جھانکنے کی کوشش کی۔ اس کا خیال تھا کہ شاید اسے اندر کچھ نظر آجائے گا۔

مگر اسی وقت سیاہ گیٹ اچانک کھلا۔

ایک ہاتھ اندر سے نکلا اور کسی نے شہریار کو بالوں سے پکڑ کر اندر کھینچ لیا!

شہریار نے تڑپ کر خود کو چھڑانے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ وہ ایک جھٹکے سے کوٹھی کے اندر صحن میں آگرا اور کسی نے سیاہ گیٹ واپس بند کردیا.....!!

(اس کے بعد کیا ہوا؟..... حق اسکواڈ کے اس سنسنی خیز کارنامے کے باقی واقعات اگلے ماہ ملاحظہ فرمایئے)

پاکستان کا بچہ

محمد جاوید خالد

ناصر بہت اچھا لڑکا تھا۔ گھر سے لے کر اسکول تک سب کی رائے یہی تھی۔ سب اس کی تعریف کرتے تھے اور یہ تعریف غلط بھی نہیں تھی۔ اپنے کام سے کام رکھنے والا وہ ایک سیدھا سادہ لڑکا تھا۔ نہ کسی کی لین دین میں، نہ کسی جھگڑے فساد میں۔ پابندی سے اسکول جاتا، توجہ سے استادوں کی باتیں سنتا اور پھر گھر آکر بھی اس کے معاملات بڑی باقاعدگی سے چلتے۔ کھیل کے وقت کھیل، نماز کے وقت نماز اور پڑھائی کے وقت پڑھائی۔ غرض کہ وہ ہر لحاظ سے ایک اچھا اور مثالی لڑکا تھا، مگر چپکے چپکے ایک خرابی پیدا

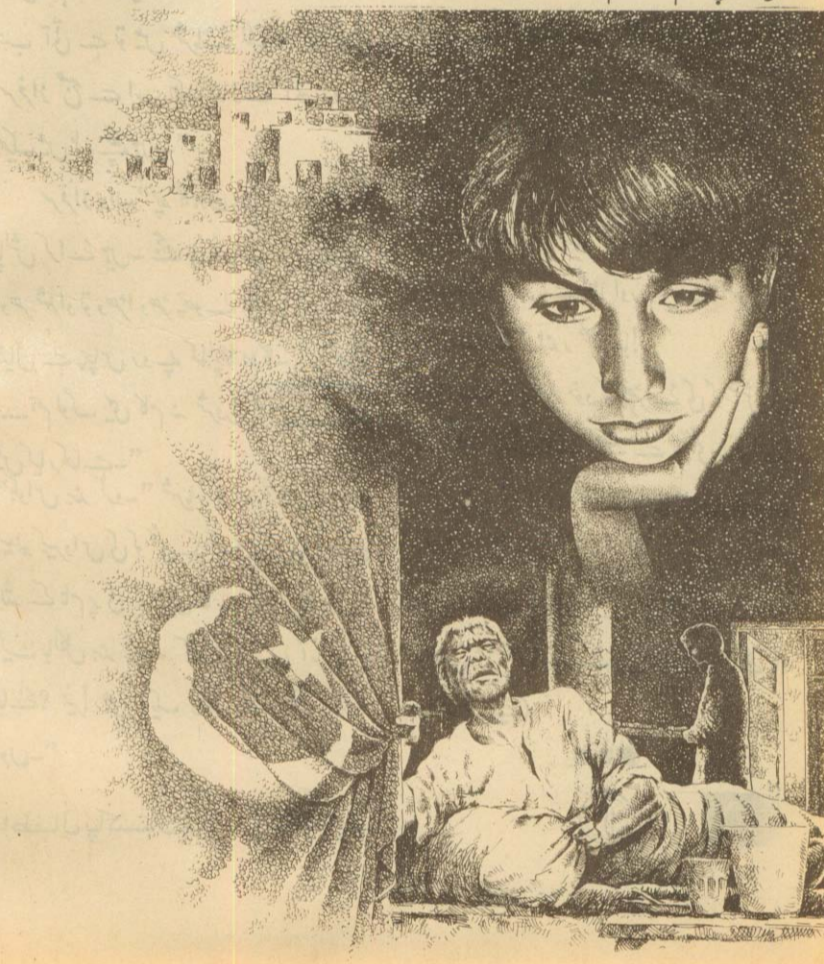

ہوگئی تھی۔

خرابی اس کے عمل میں تو کہیں نہیں آئی تھی۔ البتہ اس کا ذہن منتشر ہوگیا تھا۔ سوچیں گڑبڑ ہوجائیں تو پھر کوئی کام بھی ڈھنگ سے نہیں ہوتا۔ ناصر کے ساتھ بھی یہی ہورہا تھا اور اس خرابی کا آغاز سرانور کی تقریر سے ہوا تھا۔ سرانور اس کے اسکول میں استاد تھے اور استاد بھی بہترین۔ بچوں کو ان کی نفسیات اور ذہنی معیار کے مطابق تعلیم دینے والے۔ ناصر کو وہ بہت پسند تھے۔ اسکول میں پاکستان کے حوالے سے تقریب ہوئی تھی اور اس تقریب میں سرانور کی تقریر ہوئی تھی۔ کلاس میں تو سرانور دھیمے لہجے اور نرم آواز میں پڑھاتے تھے مگر ناصر نے ان کی تقریر پہلی بار سنی تھی اور حیران رہ گیا تھا۔ کیسی گھن گرج تھی ان کے لہجے میں اور کیسی بلند آواز تھی ان کی جو در و دیوار کے ساتھ ٹکرا کر گونج رہی تھی۔ پاکستان کی بات کرتے ہوئے وہ ہمیشہ جذباتی ہوجاتے تھے۔ یہ ان کی وابستگی تھی۔ اس روز بھی وہ بہت جوش میں تھے اور تقریر کے آخر میں وہ براہِ راست بچوں سے مخاطب ہوگئے تھے۔ "سنو!!" انہوں نے بہت جذباتی ہوکر کہا تھا۔ "اب تم لوگ ہی کچھ کرو گے، تم ..... تم پاکستان کے بچے ہو اس کی امیدوں کا مرکز، اس کا مستقبل، اور ..... بچوں سے امیدیں ہوا ہی کرتی ہیں۔ اپنے بچے اسی لئے اچھے لگتے ہیں۔ تم پاکستان کے بچے ہو اسے یاد رکھنا۔ اپنے ماں باپ کی تم اولاد ہو، مگر بچے پاکستان کے ہو، صرف پاکستان کے ..... پاکستان تم پر انحصار کرتا ہے۔"

یہاں تک تو کوئی خرابی نہیں تھی۔ سرانور کی تقریر سے اسکول کے سارے لڑکوں میں بے پناہ جوش و جذبہ پیدا ہوگیا تھا۔ ناصر کچھ زیادہ ہی متاثر ہوا تھا۔ شروع شروع میں تو اس نے باقاعدہ اپنے نام کے آخر میں لکھنا شروع کردیا تھا، "پاکستان کا بچہ" پھر کچھ سوچ کر اس نے نام کے اس حصے کو تھوڑا سا ماڈرن کرلیا تھا۔

اب وہ اس کی جگہ "پی کے بی" لکھنے لگا تھا۔ جب وہ کہیں اپنا نام لکھتا "راجہ محمد ناصر پی کے بی" اور پڑھنے والا حیران ہوکر "پی کے بی" کا مطلب پوچھتا تو وہ بڑے عزم اور فخر سے جواب دیتا۔ "پاکستان کا بچہ۔"

خرابی کی بات یہ بھی نہیں تھی بلکہ یہ بات تو اس کی خوبی بنتی جارہی تھی۔ خاص طور پر جب سے سرانور کے علم میں یہ بات آئی تھی اور انہوں نے اسے سراہا تھا تو اس کے اعتماد میں کچھ اور اضافہ ہوگیا تھا۔ سرانور کے علم میں بھی یہ

بات اچانک ہی آگئی تھی۔ ایک دن کسی کام سے وہ ان کے پاس گیا۔ انہوں نے نام پوچھا تو ناصر نے حسب عادت کڑک کے جواب دیا۔

"راجہ محمد ناصر پی کے بی" سرانور نے پہلے تو اسے چونک کر دیکھا پھر دہرایا۔ "راجہ محمد ناصر پی کے بی" پھر مسکرا کر کہنے لگے "کیوں بھئی یہ "پی کے بھی" تو آخر "کھا کے بھی" کیوں نہیں۔" مگر جب ہنستے ہوئے اس نے "پی کے بی" کا مطلب بتایا تو انہوں نے اٹھ کر اسے سینے سے لگالیا اور اس کی پیشانی چوم لی۔

خرابی اصل میں وہاں سے شروع ہوئی جب اس نے محلے کے لڑکوں کو قائل کرلیا کہ محلے کی ایک نمایاں جگہ پر پاکستان کا جھنڈا مستقل لگادیا جائے۔ "یہ کیا کہ ایک چیز ہماری عزت، عظمت اور آزادی کی علامت ہو اور ہم اسے کسی خاص مہینے کے خاص دن میں ہی نمایاں کریں۔" اس نے کہا تھا اور سب لڑکوں نے تائید کردی تھی۔ جھنڈا اس نے خود تیار کیا اور خود ہی لگانے کے لئے چچا فضل دین کے چھجے پر چڑھ گیا۔

"کون ہو تم، کیا کررہے ہو؟" چچا فضل دین کی کرخت آواز سن کر وہ ایک لمحے کو تو سُن ہی ہوگیا۔ اس کی غلطی بھی تھی۔ مکان پر تالا تھا تو اسے چچا فضل دین کے آنے کا انتظار کرنا چاہیے تھا۔ مگر اچھا کام کرنے کے جوش میں وہ یہ غلطی کر بیٹھا تھا۔ پھر بھی اسے یقین تھا کہ اچھا کام کرتے ہوئے اس بُری حرکت پر اسے کوئی سرزنش نہیں کرے گا۔ چنانچہ اس نے سنبھل کر جواب دیا۔ "جھنڈا لگارہا ہوں چچا۔"

"جھنڈا!! کیسا جھنڈا۔" ان کی آوز میں ابھی تک کرختگی تھی۔

"پاکستان کا جھنڈا ہے چچا۔" اس نے مسکراتے ہوئے جھنڈا ہلایا۔

مگر یہ سن کر تو چچا فضل دین کا غصہ اور تیز ہوگیا۔ وہ تو آپے سے باہر ہوگئے۔ چلا کر بولے۔

"اتر نیچے، پاکستان کا بچہ....."

اس لہجے اور اس انداز کا وہ بالکل بھی عادی نہیں تھا، سہم کر نیچے اتر آیا۔ اس کے کانوں میں رہ رہ کر یہی الفاظ ڈنک مار رہے تھے، "اتر نیچے پاکستان کا بچہ....." اس نے آہستہ سے دہرایا۔ "پاکستان کا بچہ....." یہ تو وہی الفاظ تھے، سرانور والے مگر آج یہ الفاظ اتنے سخت کیوں ہوگئے تھے۔ آج تو یہ عزم و محبت والے الفاظ نفرت اور حقارت کی علامت بن گئے تھے۔ اس کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔

"کیوں بچے کا دل توڑ رہے ہو فضل دین" وہ

کوئی برا کام تو نہیں کر رہا۔" امتیاز صاحب نے ناصر کی حمایت کرتے ہوئے کہا۔ امتیاز صاحب بھی اسی محلے کے ایک پڑھے لکھے آدمی تھے۔

"مگر میں تو اسے برا کام سمجھتا ہوں۔" چچا فضل دین نے کڑک کر کہا۔ "تمہارے کہنے سے کیا ہوتا ہے؟"

"تم.... تم پاکستان کا جھنڈا لگانے کو برا کام سمجھتے ہو؟" امتیاز صاحب نے حیران ہو کر کہا۔

"ہاں سمجھتا ہوں پھر....." چچا فضل دین نے کاٹ کھانے والے لہجے میں کہا۔

"تم پاکستانی نہیں ہو؟" امتیاز صاحب ابھی تک حیران تھے۔

"مجھے اس پر کوئی خوشی نہیں ہے؟" چچا فضل دین نے جواب دیا تو سارا مجمع سناٹے میں آگیا۔ مارے حیرت کے کسی سے بھی کچھ نہ کہا گیا۔ سب چچا فضل دین کو گھور رہے تھے اور اس خاموشی کو بھی چچا فضل دین نے ہی توڑا۔ وہ بڑبڑاتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ "کان پک گئے پاکستان پاکستان سُن سُن کر نہ کوئی ڈھنگ، نہ کوئی طریقہ۔ اپنی لیڈری چمکانے کے لئے پاکستان کا نعرہ لگادیا۔ اتنے بڑے ملک کو تقسیم کر کے رکھ دیا۔ پھر پاکستان بھی کٹ گیا دو حصوں میں، بیچ میں فاصلہ ایک ہزار میل کا۔ اسے تو کٹنا ہی تھا، کٹ گیا، اب پھر پاکستان، پاکستان لاحول ولا قوۃ....."

"بس کرو فضل دین بس کرو، اپنی ان خرافات کو بند کرلو۔" امتیاز صاحب کی آواز بلند ہوئی تو راہ چلتے لوگ بھی رک گئے کیونکہ امتیاز صاحب کو اونچی آواز سے بولتے آج تک کسی نے نہیں سنا تھا۔ "جس تھالی میں کھاتے ہو، اسی میں چھید کرتے ہو۔"

"اس کی تھالی میں نہیں کھاتا۔" چچا فضل دین نے بھنا کر کہا۔ "میرا بیٹا دبئی سے پیسے بھیجتا ہے اور تمہاری ملکی دولت میں اضافہ کرتا ہے، وہ کھاتا ہوں۔"

"تو چلے جاؤ پھر اپنے پسندیدہ ملک میں، چھوڑ دو پاکستان کو۔" امتیاز صاحب گرجے۔

"سو دفعہ چھوڑ دیتا، تمہاری حکومت ویزا ہی نہیں دیتی اور پھر یہ مجبوری بھی ہے میں وہاں مستقل نہیں رہ سکتا، پاکستانی جاسوس سمجھا جاؤں گا، پاکستانی....." چچا فضل دین نے کڑوے لہجے میں کہا۔ "چلا جاؤں گا، میں نے اپنے بیٹے سے کہہ دیا ہے اسے دبئی سے پاکستان آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ سیدھا ہندوستان چلا جائے گا وہیں شادی بیاہ کرے گا، وہیں اپنا کنبہ خاندان بنائے گا اور عزیز رشتہ دار بھی ہیں۔ وہیں قدم جمائے گا پھر بلا جاؤں گا میں بھی۔"

اس سے پہلے کہ بات اور بڑھتی، کچھ لوگوں نے سمجھا بجھا کر امتیاز صاحب کو الگ کیا اور چچا فضل دین کو ان کے گھر بھیج دیا۔ مگر چچا فضل دین کی باتوں سے بیزار سب ہوئے، سب نے ان کا معاشی بائیکاٹ کردیا، ان سے ملنا جلنا چھوڑ دیا۔ چچا فضل دین لوگوں میں پہلے بھی بہت زیادہ گھلتے ملتے نہیں تھے، اب بھی انہیں اس بائیکاٹ کی پروا نہیں تھی۔ وہ اپنے مکان میں الگ تھلگ خوش تھے۔ البتہ آتے جاتے، کسی سے مخاطب ہوئے بغیر وہ بڑبڑاتے رہتے، پاکستان کو، اس کے قیام کو، اس کے بانیوں کو بہانے بہانے سے بُرا کہتے اور ایسی ایسی باتیں کرتے کہ خدا کی پناہ۔

ناصر کو شریر لڑکوں کی طرح داؤ پیچ کہاں آتے تھے۔ وہ تو سیدھے سادے ذہن کا سیدھا سا لڑکا تھا، اب چچا فضل دین کی باتوں نے اس کے ذہن میں ہلچل مچادی تھی۔ اس کے ذہن میں تو پاکستان، اس کے قیام اور بانیوں کے بارے میں وہی تھا جو سرانور نے بتایا تھا۔ اس کا کوئی دوسرا پہلو بھی ہے اس نے کبھی سوچا تک نہ تھا اور اس بات کا دوسرا پہلو کیا نکلا پھر تو جیسے ہر بات کی دو دو باتیں ہونے لگیں۔ جس مسجد میں وہ نماز پڑھنے جاتا تھا وہاں کچھ اور لوگوں نے آکر اختلافی باتیں کرنا شروع کردیں۔ ان کی دال تو نہ گلی لیکن ایک دن ان میں سے ایک نے چیخ چیخ کر کہا۔ "تم لوگ کافر ہو، اس مسجد میں کسی کی نماز نہیں ہوتی، سب جہنم میں جائیں گے ...." وہ بات بھی آئی گئی ہوگئی مگر ناصر کے دماغ میں ایک گرہ اور پڑگئی۔ اس کے خیال میں مذہب کا ایک ہی رخ اور ایک ہی انداز تھا جو اس نے اختیار کیا ہوا تھا۔ مگر.... پھر یہ ہوا کہ وہ کچھ دنوں کے لئے اپنی امی کے ساتھ ماموں کے ہاں چلا گیا۔ وہاں کا رنگ ڈھنگ ہی جُدا تھا۔ ہوش سنبھالنے کے بعد وہ پہلی بار ماموں کے ہاں گیا تھا اور اس نے سوچا تھا کہ ماموں زاد بہن بھائیوں سے بڑی بے تکلفی کے ساتھ تعلیم پر، کتابوں پر، استادوں کے بارے میں گفتگو کرے گا۔ مگر وہ اردو میڈیم کا تھا، اردو کا شیدائی اور دیوانہ۔ جبکہ ماموں کے ہاں انگریزی میڈیم تھی۔ اور اس میڈیم کے انگریزی ہونے نے سارے گھر کو بدل کے رکھا ہوا تھا۔ فکرو خیال سے لے کر بول چال تک اور چال ڈھال سے لے کر لکھنے پڑھنے تک کوئی چیز بھی ناصر کے مزاج کے مطابق نہ تھی۔ اگلے دن ہی وہ خود کو وہاں اجنبی محسوس کرنے لگا۔ تعلیم کے حوالے سے بھی ایک نیا پہلو اس کے سامنے آیا تھا اور ایک گرہ اس کی سوچوں میں اور پڑگئی تھی۔

"چھٹی کے بعد ناصر اسٹاف روم میں

آجائیں گے باقی سب جاسکتے ہیں۔" سرانور نے کلاس میں آکر اعلان کیا تو ایک کھلبلی سی مچ گئی۔ ناصر پریشان ہوا لیکن سرانور سے وہ بہت مانوس تھا اس لئے وہ مطمئن سا ہو کر اسٹاف روم کی طرف چل دیا۔ سرانور سر جھکائے کسی کام میں مصروف تھے۔ اسٹاف روم میں اور کوئی نہ تھا۔ سر اٹھائے بغیر انہوں نے ہاتھ سے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ناصر بیٹھ گیا۔ سرانور اپنے کام میں لگے رہے اور وہ پریشان پریشان سا اپنے اوٹ پٹانگ خیالات کو جمع کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

سرانور نے سر اٹھایا اور کچھ دیر تک ناصر کی آنکھوں میں جھانکتے رہے، ناصر نے گھبرا کر نظریں نیچی کرلیں۔

"تمہیں کیا پریشانی ہے؟" کچھ دیر کے بعد انہوں نے بھاری آواز لیکن ہلکے لہجے میں پوچھا۔

"جی... جی کچھ نہیں۔" وہ اور گھبرا گیا۔

"سنو!! میں کیسا آدمی ہوں؟"

"جی..... جی...." ناصر کی کچھ سمجھ میں ہی نہیں آرہا تھا کہ سرانور کیا کہنا چاہ رہے ہیں اور اسے کیا کہنا چاہیے۔

"دیکھو ناصر....." وہ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد آہستہ آہستہ بولے۔ "میں صاف بات کرتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ تم میرے بارے میں بہت اچھی رائے رکھتے ہو۔ میں بھی تم کو پسند کرتا ہوں اور تمہیں اسکول کے ان بچوں میں شمار کرتا ہوں جو بڑے ہو کر ملک و قوم کا سرمایہ بنتے ہیں۔ تمہارے سوچنے سمجھنے، امتحان دینے کا ایک خاص انداز ہے مگر اب تمہاری کاپیاں چیک کرتے ہوئے میں نے صاف طور پر محسوس کیا کہ تم اس ناصر کو پیچھے چھوڑتے جارہے جو ایک اچھا طالب علم ہے۔ تمہارے جوابات غیر تسلی بخش ہیں اور تمہارا انداز تحریر الجھا ہوا ہے۔ یقیناً تمہیں کوئی پریشانی ہے۔ وہی میں جاننا چاہتا ہوں اور سنو.... مجھ پر اعتماد کرو میں تمہاری پریشانی دور کرسکتا ہوں۔ مجھے تم سے بہت سی توقعات ہیں۔"

اسٹاف روم میں کچھ دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ سرانور بھی اس کے بعد کچھ نہیں بولے، بس اس کی طرف دیکھتے رہے۔ آہستہ آہستہ ناصر نے سر اٹھایا تو اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ سرانور اٹھے، انہوں نے گلاس میں پانی لیا اور انور کی طرف بڑھادیا۔ گلاس رکھ کر وہ پھر اس کے قریب آئے، اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور جھک کر آج پھر اس کی پیشانی چوم لی۔ "مجھے بتاؤ" انہوں نے کہا۔ "جو بھی بات ہے، مجھے بتاؤ۔"

"سر....." ناصر نے گویا اپنی ساری قوت جمع کرکے آہستہ سے ہونٹ کھولے۔ "سر میں بھی محسوس کررہا ہوں کہ میرا دھیان پڑھائی میں نہیں لگ رہا۔ میرے دل میں عجیب عجیب خیال آنے لگے ہیں ...." پھر اس نے رک رک کر ذہن میں پڑنے والی ساری گرہیں سر انور کے سامنے رکھ دیں۔ پاکستان کی، نماز کی، اردو انگریزی میڈیم وغیرہ وغیرہ سب۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا سر...." اس نے آخر میں کہا۔ "کہ کیا ٹھیک ہے کیا غلط ہے؟ مجھے کیا اختیار کرنا چاہیے اور کیا چھوڑ دینا چاہیے۔ میں الجھتا جارہا ہوں سر اور اس الجھن میں مجھ سے کوئی کام ٹھیک طرح سے نہیں ہورہا۔" اس کی آواز بھرا گئی۔

"بس اتنی سی بات ہے؟" سر انور نے کہا تو اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ وہ مسکرا رہے تھے۔ ناصر ان کے مسکرانے پر سخت حیران تھا۔ جو الجھن کسی بھاری پہاڑ کی طرح اس پر مسلط تھی سر انور کے نزدیک بس وہ اتنی سی بات تھی۔

"دیکھو بیٹے ...." سر انور نے نہایت سنجیدگی سے کہنا شروع کیا۔ "میں تمہارا سارا مسئلہ سمجھ گیا ہوں اور میں تمہیں کوئی لمبی چوڑی نصیحت نہیں کروں گا۔ میری صرف دو باتیں یاد رکھو۔ ایک تو یہ کہ اچھی نیت کو دماغ سے اور بے غرض محبت کو دل سے کبھی جدا مت کرو اور دوسرے یہ کہ چیزوں کی حقیقت تک پہنچنے کا واحد ذریعہ علم ہے، جب کسی بات میں الجھو، علم کی جستجو میں لگ جاؤ۔ علم تمہیں خود الجھن کے جنگل سے نکال کر لے آئے گا۔"

سر انور چپ ہوگئے تھے، ناصر نے ان کی دونوں باتوں کو دل ہی دل میں دہرایا اور جانے کیا بات اس کی سمجھ میں آئی کہ اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ سر انور مسکرا دیئے۔ اس کے چہرے کی اداسی بھی دور ہوگئی اور اس کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ بکھر گئی۔ "اس دنیا میں بہت کھوٹ بھی ہے بیٹے۔" وہ پھر بولے۔ "لیکن کھوٹ اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب نیت میں خرابی آتی ہے اور مخلوقِ خدا کی محبت دل سے نکل جاتی ہے۔ تمہیں اس کھوٹ کو سمجھنا ہی نہیں دور بھی کرنا ہے۔ لیکن ہوگا اسی ذریعہ سے جو میں تمہیں بتا چکا۔ بس اب تم جاؤ۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے ہاتھ آگے بڑھادیا۔ ناصر نے تیزی سے کھڑے ہو کر ان کا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ اس کی آنکھوں میں عزم و یقین کی چمک تھی۔

چچا فضل دین پر سچ مچ برے دن آگئے تھے۔ اپنی بدزبانی اور برے خیالات سے انہوں نے

محلے بھر کو اپنا دشمن بنایا ہوا تھا۔ اس سے زیادہ بری بات یہ ہوئی تھی کہ ان کی ہدایت کے عین مطابق ان کا بیٹا دبئی سے ہندوستان جاچکا تھا۔ وہاں جاکر اس نے کاروبار جمالیا تھا اور بیاہ بھی رچالیا تھا۔ مگر باپ کو بالکل فراموش کردیا تھا۔ پہلے خط بند ہوئے پھر پیسے بھی۔ خود چچا فضل دین اب کچھ کرنے کے قابل نہ رہے تھے۔ کمزوری اور بیماریوں نے انہیں ایک ساتھ گھیرلیا تھا۔ بینائی کم ہوتے ہوتے نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ شروع شروع میں چھوٹی موٹی چیزیں فروخت کرکے انہوں نے گزر بسر کرنے کی کوشش کی مگر کب تک؟ نتیجہ یہ کہ سرچھپانے کا ایک ٹھکانہ ان کے پاس تھا اور بس۔ خاندان بہت پہلے ٹوٹ پھوٹ چکا تھا۔ اکلوتا بیٹا ہندوستان میں تھا اور اپنی دنیا میں مست اور یہاں کا یہ حال کہ محلے والے ان سے نالاں اور وہ محلے والوں سے بیزار۔

کھانسی کا شدید دورہ اٹھا اور وہ پیٹ پر ہاتھ رکھ کر دوہرے ہوگئے۔ سانس رکتی ہوئی محسوس ہوئی مگر اٹھ کر پانی پینے کی سکت نہیں تھی۔ لگتا تھا کہ شاید آخری وقت آگیا ہے۔ ناگاہ کسی نے آہستہ سے ان کی کمر کو سہلایا اور اس کے ساتھ ہی پانی کا کٹورا ان کے منہ سے لگادیا۔ غٹاغٹ کرکے بڑی بے صبری سے انہوں نے چند گھونٹ پانی پیا۔ سانس کچھ بحال ہوئی تو پہلا خیال آیا کہ یہ خلافِ معمول نیکی کا فرشتہ بن کر کون ان کے گھر میں آگیا۔

"کون؟ کون ہو تم؟" انہوں نے کٹی پھٹی آواز میں پوچھا۔ لیکن جواب ندارد۔ کچھ دیر خاموشی رہی تو انہوں نے قدرے مہذب ہو کر پوچھا۔ "آپ کون ہیں؟" اس بار بھی خاموشی رہی تو انہوں نے نسبتاً اونچی آواز میں پوچھا۔ "جواب کیوں نہیں دیتے، آپ کون ہیں؟" مگر چچا فضل دین کو جواب اب بھی نہ ملا۔ البتہ کسی نے چمچ ان کے کھلے منہ میں ڈال دیا۔ انہوں نے بے ساختہ منہ بند کیا تو معلوم ہوا کہ نیم گرم اور خوش ذائقہ کھچڑی ان کے منہ میں موجود ہے۔ خدا جانے کتنے وقت کا فاقہ تھا کہ باقی باتیں بھول کر انہوں نے تیز تیز منہ چلانا شروع کردیا۔ تھوڑی دیر میں پلیٹ صاف ہوگئی۔ کھلانے والے نے پانی کا کٹورا ایک دفعہ پھر ان کے منہ سے لگادیا۔ پانی پینے کے بعد انہیں ایک بار پھر اپنے محسن کو جاننے کا اشتیاق ہوا۔ نہایت خوش اخلاقی سے وہ منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے گویا ہوئے۔ "آپ نے بڑا کرم فرمایا۔ آپ نہ ہوتے تو شاید آج میں مرہی جاتا۔ مگر یہ تو بتائیے آپ

کون ہیں؟ کہاں سے تشریف لائے ہیں۔" لیکن اس خوش اخلاقی کا بھی کچھ نتیجہ نہ نکلا۔ انہیں کوئی جواب نہ ملا۔ البتہ آوازوں سے انہوں نے اندازہ لگایا کہ برتن دھولئے گئے، انہیں ان کے ٹھکانے پر رکھ دیا گیا پھر یہ آوازیں دروازے تک گئیں اور کوئی آہستہ سے دروازہ بند کرتے ہوئے باہر نکل گیا۔ کچھ دیر بعد چائے آگئی۔

اب تو یہ معمول بن گیا تھا۔ کبھی دروازہ بند ہوتا تو کھٹکھٹالیا جاتا۔ مگر کھٹکھٹانے والا اِدھر اُدھر ہو جاتا۔ اگر چچا فضل دین دروازہ کھول کر واپس اپنے بستر پر چلے جاتے تو کوئی آتا، صفائی ستھرائی کرتا، انہیں کھلاتا پلاتا، برتن دھوتا اور آہستگی سے واپس چلا جاتا۔ پوچھتے پوچھتے ایک دن ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا اور وہ پھٹ پڑے۔ "خدا کے لئے تم جو کوئی بھی ہو مجھ پر رحم کرو مجھے بتاؤ تم کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟" اس کے ساتھ ہی جانے کیا ہوا وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

کسی نے اپنے ہاتھ ان کی آنکھوں پر رکھ کر چہرہ صاف کرنا شروع کیا ہی تھا کہ انہوں نے تیزی سے وہ ہاتھ پکڑ کر اپنے منہ پر رکھ لئے اور بے ساختہ انہیں چوم لیا۔ پھر انہوں نے کھینچ کر ہاتھ والے کو اپنے قریب کرلیا۔ آج اس نے بھی کوئی مزاحمت نہیں کی۔ انہوں نے جلدی جلدی اس کے سر اور چہرے کو دونوں ہاتھوں سے ٹٹولا۔ پھر بولے۔ "تم لڑکے ہو، ایک نوعمر لڑکے۔" پھر ان کی آواز میں ایک دم التجا شامل ہوگئی۔ "دیکھو بیٹے تمہیں تمہارے خدا کا واسطہ، تمہیں تمہارے ماں باپ کا واسطہ، مجھے بتا دو تم کون ہو؟ تم کس کے بچے ہو؟"

"میں ...." ایک نرم سی آواز کمرے میں گونجی۔ چچا فضل دین کا گویا سارا وجود صرف کان بن کر رہ گیا تھا۔ "میں پاکستان کا بچہ ہوں۔"

روشنی کا ایک جھماکا ان کے دماغ میں ہوا۔ انہوں نے جھپٹ کر اسے سینے سے لگالیا۔ "تم ..... تم پاکستان کے بچے ہو ..... تم ناصر ہو ناصر ...." اور جانے کتنے ہی بوسے انہوں نے اس کے سر اور پیشانی کے لئے۔ پھر جیسے کسی طوفان کے گزر جانے کے بعد ایک ٹھہراؤ سا پیدا ہو جاتا ہے، پرسکون ہو کر انہوں نے دو چار لمبی لمبی سانسیں لیں۔ ناصر کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں لیا اور بڑے خلوص سے بولے "تم پاکستان کے بچے ہو، اور جس کے بچے تم جیسے ہوں، دنیا کی کوئی طاقت اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔" ناصر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی، ایک دل کش مسکراہٹ۔

نیا عہد ہے نئے تقاضے، نئی امنگیں
عزت سے گر جینا ہے تو پڑھنا ہوگا

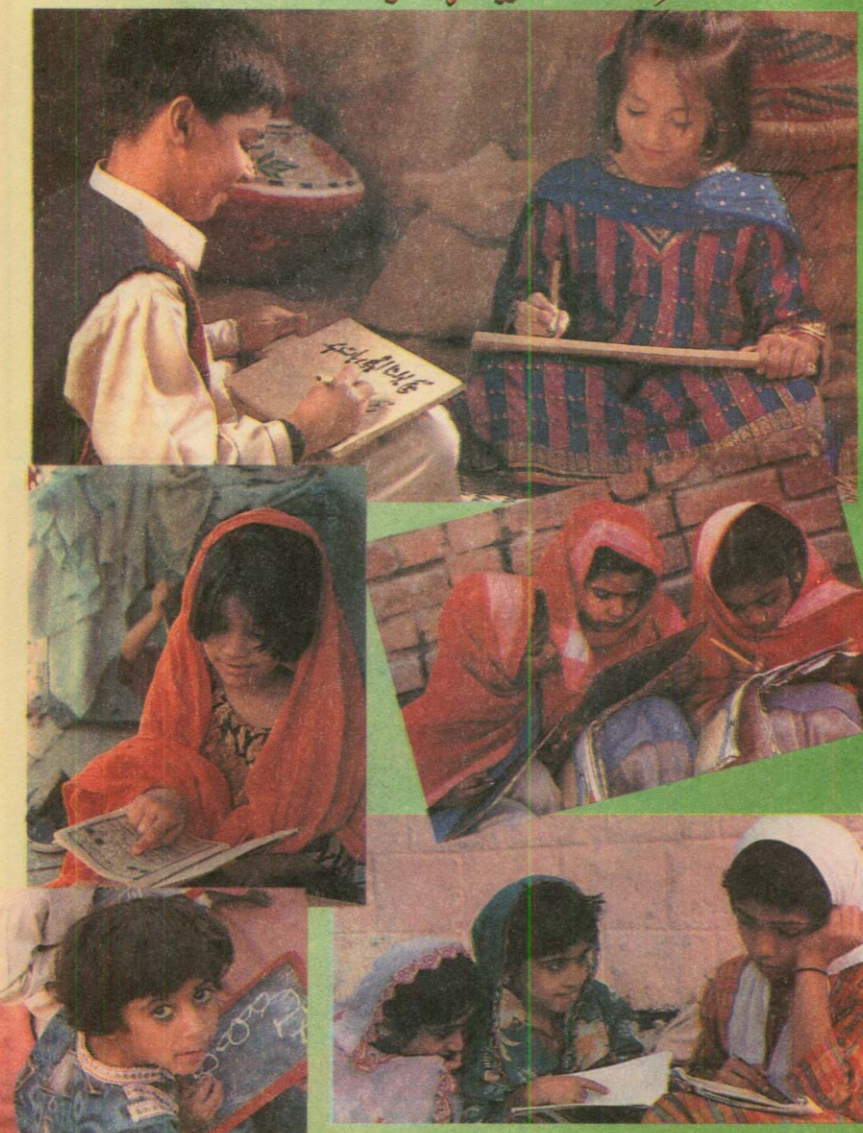

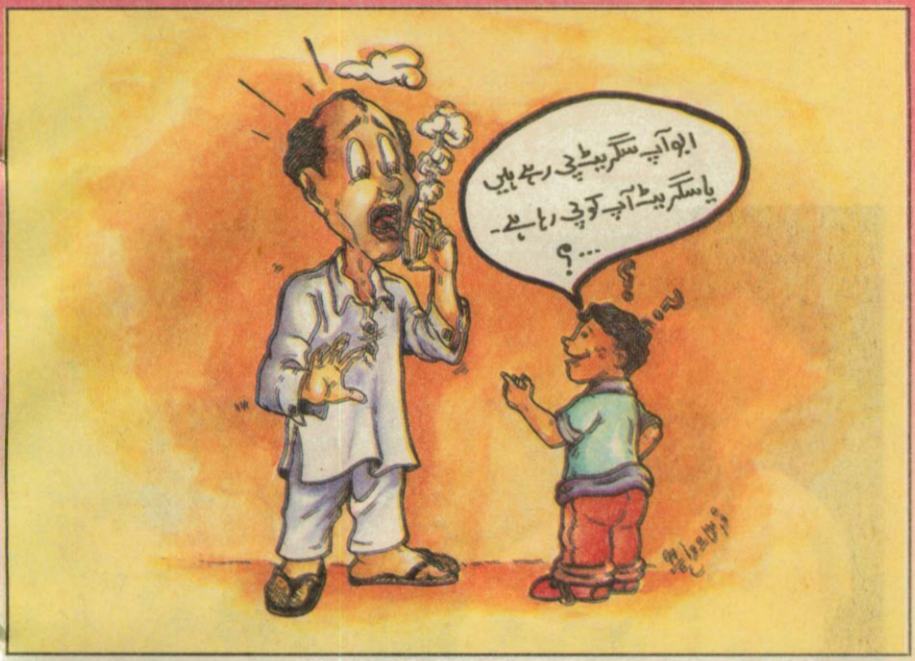
ابو آپ سگریٹ پی رہے ہیں
یا سگریٹ آپ کو پی رہا ہے۔
؟...

میرے ابو کہتے ہیں کہ کھیلنے سے
پہلے ہمیشہ وارم اپ کر لینا چاہیئے

پہلا انعام

سلیم مغل

اقوام متحدہ کے زیر اہتمام بچوں کیلئے منعقد ہونے والی سربراہی کانفرنس کے موقع پر ایک اخباری مراسلے سے متاثر ہوکر

"ارے کم بخت تو پھر لکھنے بیٹھ گیا!" ابا غصے سے چلائے۔ "کتنی بار سمجھایا ہے تجھے کہ چھوڑ دے کہانیاں لکھنا۔ کچھ نہیں رکھا اس میں..... مگر تو ہے کہ تیری سمجھ میں کچھ آتا ہی نہیں۔"

ابا کو غصے میں دیکھ کر رشید نے فوراً اپنا قلم بند کیا۔ میز پر بکھرے ہوئے کاغذ جلدی سے سمیٹ کر بستر کے نیچے چھپائے اور ابا کے سامنے یوں آکر کھڑا ہو گیا جیسے اس نے ابا کی آواز سنی ہو مگر سمجھی نہ ہو۔ "جی ابا..... آپ کچھ کہہ رہے تھے کیا؟" رشید نے جان بوجھ کر ان جان بنتے ہوئے پوچھا۔

"تو کہانیاں لکھنے سے باز نہیں آئے گا کیا.....؟" ابا نے رشید کو سامنے پاکر قدرے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

"کیسی کہانی ابا؟" میں تو بشیر چاچا کو خط لکھ رہا تھا۔"

"اچھا اچھا..... پھر ٹھیک ہے مگر یاد رکھ کہانی وہانی مت لکھیو ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا' کیا سمجھے؟"

"نہیں ابا کہانی نہیں لکھوں گا۔ کبھی اعتبار بھی کرلیا کرو۔"

آج پھر رشید نے جھوٹ بول کر خطرہ ٹال دیا تھا۔ مگر وہ اس بات پر خوش نہ تھا کہ اسے ہر روز محض اس لیے جھوٹ بولنا پڑتا تھا کہ وہ کہانی لکھتا ہے..... "یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔" اس نے اپنے آپ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "آخر کب تک جھوٹ بولتا رہوں گا اور پھر کہانی لکھنا اتنا بڑا جرم ہے کیا؟ ابا کیوں چڑتے ہیں کہانی لکھنے سے؟" ایسے بہت سے سوال اس کے ذہن میں آتے مگر ابا کے سامنے کچھ کہنے کی جرأت نہ ہوتی۔ وہ اکیلے میں خود ہی بڑبڑا کر چپ ہوجاتا یا کبھی کبھار اماں کے سامنے اپنا دکھڑا رولیتا..... اتنی جرأت تو اماں میں بھی نہ تھی کہ وہ ابا سے اس مسئلے پر بات کرتیں اِس لیے اماں بھی اسے سمجھا بجھا کر چپ کرادیتیں۔ رشید کی عمر بھی کوئی زیادہ نہ تھی۔ یہی گیارہ' بارہ برس ہوگی مگر اس کم عمری ہی میں اسے کہانیاں لکھنے کا ایسا چسکا لگ گیا تھا کہ اب اسے اس کام کے علاوہ کسی اور کام میں مزہ ہی نہ آتا..... اپنے فارغ اوقات میں یا دوسرے کاموں کے دوران وہ اپنی کہانی کے تانے بانے بنتا رہتا اور جہاں کچھ وقت ملتا وہ فوراً لکھنے بیٹھ جاتا۔ وہ اب تک اس طرح ایک سو سے زیادہ کہانیاں لکھ چکا تھا اور ان کہانیوں میں سے بھی زیادہ تر اخبارات میں بچوں کے صفحات پر شائع ہو چکی تھیں۔ چھوٹی سی عمر میں اتنی بہت سی کہانیوں کی اشاعت کوئی معمولی

بات نہ تھی مگر اس غیر معمولی کارنامے کے باوجود اس کے دوست اور محلے کے دوسرے لڑکے یہ ماننے کو تیار نہ تھے کہ یہ کہانیاں اس نے لکھی ہیں۔ شریر لڑکوں کی ایک ٹولی رشید کو دیکھتے ہی لک لک کر گانے لگتی۔

ہر طرف یہ شور ہے
رشید کہانی چور ہے

یہ نعرہ رشید کا ننھا سا دل بجھا کر رکھ دیتا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ کئی بار اس نے قسمیں کھا کر یقین دہانی کرانی چاہی کہ یہ کہانیاں اس نے خود لکھی ہیں مگر لڑکوں نے اس کی بات ماننے سے انکار کردیا۔

آخر ایک روز اس کی یہ الجھن ضیاؔ بھائی نے دور کردی۔ ضیاؔ بھائی نے رشید کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ "دیکھو رشید میاں تم اتنی اچھی کہانی لکھتے ہو کہ تمہاری عمر کا کوئی اور لڑکا عام طور پر ایسی کہانی نہیں لکھ سکتا۔ اسی لیے لڑکوں کو یقین نہیں آتا۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ وہ لڑکے جو کہ نکمے ہیں اور پڑھنے لکھنے سے جی چراتے ہیں اس لیے وہ تم سے حسد کرتے ہیں اور تمہیں تنگ کرتے ہیں مگر تم ان کی پرواہ نہ کرو اور لکھتے رہو۔ ایک دن آئے گا جب سب لوگ تمہیں بہت بڑا ادیب تسلیم کرلیں گے۔ مگر یاد رکھو ہمت نہ ہارنا۔"

ضیاؔ بھائی کی باتیں اسے حوصلہ دیتیں اور وہ مطمئن ہوجاتا۔ یوں بھی وہ ضیا بھائی سے بہت متاثر تھا، اس لئے کہ ضیا بھائی بستی میں سب سے زیادہ پڑھے لکھے تھے۔ بستی کے لوگ ضیا بھائی کو "کتاب کا کیڑا" کہتے تھے۔ وہ واقعی کتابوں میں گھرے رہنے والے صاحبِ علم شخص تھے۔ رشید نے انھیں اپنا آئیڈیل بنا رکھا تھا۔ وہ اخبار کو اپنی کہانی بھجوانے سے قبل انھیں دکھا کر اصلاح ضرور لے لیا کرتا۔ ضیا بھائی رشید سے گو بیس پچیس برس بڑے تھے مگر رشید کے شوق اور علم سے اس کا لگاؤ دیکھتے ہوئے انہوں نے اسے اپنا دوست بنا لیا تھا اور وہ ہمیشہ رشید کو مخاطب بھی "میرے کم سن دوست" کہہ کر کیا کرتے۔

ضیاؔ بھائی کی دوستی رشید کو راس آئی اور وہ جنوں بھوتوں اور بادشاہوں کی کہانیوں کے بجائے قدرے مشکل موضوعات پر بھی لکھنے لگا۔

ضیاؔ بھائی سے منتقل ہونے والے مطالعے کے شوق نے رشید کی صلاحیتیں اور بھی نکھار دی تھیں اور اب اس کی کہانیوں میں جا بجا علمی حوالے بھی نظر آنے لگے تھے۔ رشید اب آہستہ آہستہ اچھا لکھنے والا بنتا جارہا تھا مگر پچھلے کچھ

عرصے سے ایک اور مشکل نے اسے گھیر لیا تھا۔

اس کی یہ مشکل خود اس کے ابا تھے جو اس کی پڑھائی چھڑوا کر اسے اپنے کسی موٹر مکینک دوست کے پاس کام سکھانے کے لیے بھجوانا چاہتے تھے۔

"ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔" رشید نے سوچا۔

"ایسا ہو کر رہے گا۔" یہ اس کے ابا کا حتمی فیصلہ تھا۔ ایک روز اسی موضوع پر گھر میں خوب چیخ و پکار ہوئی۔ رشید کے ابا کی آنکھیں ابلی پڑ رہی تھیں اور چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔

"یاد رکھ کہ مزدور کا بیٹا ادیب کبھی نہیں بن سکتا۔ اپنی اوقات کو نہ بھول۔ اس پاگل ضیا نے تجھے بھی پاگل کر دیا ہے۔ اگر میرا کہنا نہیں مان سکتا تو نکل جا گھر سے اور اگر گھر میں رہنا ہے تو کل سے استاد کے پاس جانا شروع کر دے۔"

رشید کے ابا غصے میں نہ جانے کیا کیا کچھ کہہ گئے۔ وہ اپنا فیصلہ سنا چکے تھے اور رشید جانتا تھا کہ اس کے ابا کی زبان سے جو ایک بار نکل جائے، وہ پتھر پر لکیر ہوتا ہے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کے ابا اس کے دشمن نہیں بلکہ غربت کے ہاتھوں مجبور ہیں۔ مرتا کیا نہ کرتا، اسے ابا کا کہنا ماننا پڑا۔

صبح سویرے جب نیلے پیلے یونی فارم پہنے ہوئے پھول سے بچے گاڑیوں میں، بگھیوں میں اور پیدل اسکول جا رہے ہوتے، رشید اپنا میلا کچیلا اور تیل مٹی سے اٹا ہوا ڈانگری جیسا لباس پہن کر استاد کے ورک شاپ کی طرف چل دیتا۔ ورک شاپ کی طرف جاتے ہوئے اسے اپنا ایک ایک قدم ایک ایک من کا محسوس ہوتا۔ اسکول چھوٹ جانے کے دکھ نے اسے اندر سے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ گو دن بھر وہ ورک شاپ پر اپنی طرح کے بہت سے بچوں کے ساتھ مل کر کام کرتا مگر کام میں اس کا دل ایک لمحے کو بھی نہ لگتا۔ دوپہر میں جس وقت اسکول کی چھٹی ہوتی اور بچوں کی ٹولیاں ہنستی، مسکراتی، باتیں کرتی اس کے سامنے سے گزرتیں تو اس کا چھوٹا سا دل بجھ کر رہ جاتا۔ اسے استاد کا ورک شاپ کسی ظالم خرکار کا بیگار کیمپ معلوم ہوتا اور اپنے آپ کو وہ پنجرے میں قید اس پرندے کی طرح سمجھنے لگتا جس کی رہائی کا کوئی امکان نہ ہو۔ کبھی کبھی اس کا دل چاہتا کہ وہ اپنے اکھڑ مکینک استاد کے سر پر ہتھوڑا مار دے اور پھر دور کہیں بھاگ جائے جہاں سے کبھی واپس نہیں آئے۔ وہ ایسا سوچتا ضرور مگر کر نہیں پاتا اس لیے کہ فطرتاً وہ سعادت مند، نیک اور سیدھا سادہ تھا۔ لڑنا جھگڑنا اور بدتمیزی کرنا تو اس نے سیکھا ہی نہ تھا۔ جن

ہاتھوں سے اب تک اس نے صرف قلم پکڑنا سیکھا تھا اب اسے انہی ہاتھوں سے پلاس، پانے، جمبور اور ہتھوڑیوں سے کام کرنا پڑتا تھا۔

ایک روز ضیاؔ نے رشید کی ڈھارس بندھائی "تم پریشان نہ ہو، میں نے تمہارے لیے وظیفے کا بندوبست کرلیا ہے۔ جس روز سے تمہیں وظیفہ ملنا شروع ہوگا تمہارے ابا کو تمہارے پڑھنے پر کوئی اعتراض نہ ہوگا بس چند روز کی بات ہے۔"

ضیاؔ بھائی کی باتوں سے امید کی کرن روشن ہوگئی۔ وہ ایک ایک دن گن کر گزارنے لگا۔ کس دن وظیفہ ملے گا اور کس دن وظیفے کی خبر سنا کر وہ اپنے ابا کو اس بات پر آمادہ کرلے گا وہ اسے پڑھنے کی اجازت دے دیں۔

چند روز بعد ایک عجیب واقعہ ہوا۔ اخبار میں ایک خبر شائع ہوئی۔ "رشید احمد کی کہانی "سچ کا صلہ" کو سال کی سب سے بہترین اور منتخب کہانی قرار دیا گیا ہے۔" خبر کے مطابق ایک ہفتے بعد شہر کے سب سے بڑے ہوٹل میں رشید کو اس کی صلاحیتوں کے اعتراف کے طور پر انعام دیا جانا تھا۔ یہ تقریب ایک بڑے عالمی ادارے کے توسط سے منعقد کی جارہی تھی۔

اخبار میں خبر کیا شائع ہوئی گویا بھونچال آگیا۔ رشید اور اس کے گھر والوں کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانا ہی نہ تھا۔ ابا جو ہمیشہ رشید کے کہانی لکھنے پر نالاں نظر آتے تھے، آج اپنے باصلاحیت بیٹے پر فخر کررہے تھے۔ استاد کا رویّہ بھی بدل گیا تھا اور ورک شاپ پر رشید کے بقیہ ساتھی بھی اسے رشک سے دیکھ رہے تھے۔ رشید کے گھر پر مبارک باد دینے کے لیے اس کے رشتے داروں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ "ملک کی ایک بڑی شخصیت اپنے ہاتھوں سے رشید کو انعام دے گی۔" رشید کو یقین نہیں آرہا تھا۔ اس کے ابا بھی بار بار یہی کہتے "کہیں یہ سب کچھ خواب تو نہیں ہے۔"

"خواب نہیں ہے رشید کے ابا، اللہ نے ہمارے دن پھیر دیئے ہیں..... میں نہ کہتی تھی، ہمارا بیٹا ایک دن ہماری قسمت بدل دے گا ....." رشید کی اماں خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھیں۔ کچھ ایسی ہی کیفیت اس کی بہن زبیدہ اور بھائی فرید کی بھی تھی۔

خدا خدا کر کے وہ دن بھی آگیا جب رشید اور اس کے اہل خانہ روشنیوں سے جگمگاتے ہوئے فائیو اسٹار ہوٹل میں داخل ہوئے۔ فائیو اسٹار ہوٹل اس سے پہلے انہوں نے نہیں دیکھا تھا۔ ان کی آنکھیں روشنیوں کی تاب نہیں لارہی تھیں اور ان کے منہ حیرت سے کھلے ہوئے تھے۔ تقریب کے آغاز میں بہت

سی تقاریر ہوئیں۔ ایک دوسرے کے قصیدے پڑھے گئے' میزبانوں نے مہمانوں اور مہمانوں نے میزبانوں کے بچوں سے مخصوص تعلق اور محبت کے حوالے دیئے۔ بچوں کی فلاح و بہبود کے لیے کیئے گئے کام اور لاکھوں روپے کے فنڈز کی بابت رپورٹس پیش ہوئیں۔

بہت سی تالیاں بجیں' خوب واہ واہ ہوئی۔ تقریب کے آخر میں جب شرکا کی بڑی تعداد اکتا کر جمائیاں لینے لگ گئی تو رشید کو اسٹیج پر بلایا گیا۔ تالیوں کے شور میں محترم مہمانِ خصوصی نے ایک لفافہ رشید کے ہاتھوں میں تھمادیا۔ اخبار کے فوٹو گرافر متحرک ہوئے۔ فلش چمکی' تالیاں بجیں' شور ہوا اور رشید واپس آگیا۔ وہ جوں ہی اپنی اماں ابا اور بہن بھائی کے پاس آیا تو سب کے چہرے خوشی سے کِھل اٹھے۔ ابا نے پیار کیا' ماں نے گلے لگایا' ابا نے احتیاط" انعام کا لفافہ اپنے ہاتھ میں لے لیا کہ کہیں خطیر رقم کا لفافہ کھو نہ جائے۔

تقریب کے ختم ہونے سے لے کر گھر پہنچنے تک وہ لفافہ سب کی توجہ کا مرکز بنا رہا۔ لفافے میں سرٹیفکیٹ کے علاوہ ایک چیک ہونے کا یقین تو سب کو تھا مگر چیک پر کتنی رقم لکھی ہوگی؟ اس کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ بے چینی سب کے چہروں سے عیاں تھی' اس سے پہلے کہ لفافہ کھلتا' فرید نے ہنگامہ کردیا "رشید بھائی مجھے سائیکل لے کر دو گے نا؟"

"ہاں لے دوں گا ..... پہلے لفافہ کھول لینے دو ....."

لفافہ کھلا تو انگریزی میں تحریر کردہ ایک کاغذ کا پرزہ سب کے ارمانوں پر اوس ڈال گیا۔ "دنیا بھر میں بچوں کے لئے کام کرنے والا یہ ادارہ رشید احمد کو بہترین کہانی لکھنے کے صلے میں اور اس کی صلاحیتوں کے اعتراف میں یہ سند عطا کرتا ہے۔"

گھر کے سب لوگ حیرت کی تصویر بنے ایک دوسرے کو دیکھ ہی رہے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ ضیا بھائی دروازے پر موجود تھے۔ انہوں نے یہ خوش خبری سنائی کہ سرکار نے رشید کے لیے پانچ سو روپے سالانہ کی اسکالرشپ منظور کرلی ہے۔

"پانچ سو روپے! سال بھر کی تعلیم کا خرچ کل پانچ سو روپے۔ تقریباً" ۴۲ روپے ماہانہ کا وظیفہ۔" نہ تو یہ وظیفہ اس کے دن پھیر سکتا تھا اور نہ ہی کاغذ کا وہ پرزہ جو اسے ایک بہت بڑی تقریب میں دیا گیا تھا۔ اس کی ساری امیدیں ایک ایک کرکے دم توڑنے لگیں۔ وہ بہت دیر تک بت بنا خاموش کھڑا رہا۔

اگلے روز رشید صبح صبح اٹھا۔ اپنی میلی کچیلی ڈانگری پہنی اور بوجھل قدموں سے استاد کے ورک شاپ کی طرف چل دیا۔

●●●

بچے ہمارا مستقبل

بچے ہر قوم کا مستقبل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی بہتر نشوونما اور تعلیم و تربیت کے لئے نہ صرف قومی بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی بچوں کی تنظیم یونیسیف نے دنیا بھر میں بچوں کے حقوق اور بقاء کے لئے ہر میدان میں کام کیا۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے بچوں کے حقوق کا جو معاہدہ منظور کیا تھا 20 نومبر 1990ء کو دنیا کے پہلے 20 ممالک نے اس کی توثیق کرکے اسے عالمی قانونی حیثیت دلا دی تھی اِس لئے اس دن کی اہمیت کے پیش نظر اقوام متحدہ کے ادارہ اطفال یونیسیف (UNICEF) کے انتظامی بورڈ نے سنہ 1992ء میں ایک قرار داد منظور کی ۔ جس کے تحت بچوں کا عالمی دن 20 نومبر کو منانے کا فیصلہ کیا گیا۔ اب تک دنیا کے 185 ممالک میں سے 177 ممالک بچوں کے عالمی معاہدے کی توثیق کر چکے ہیں۔ اس دن کو عالمی سطح پر منانے کے لئے دو مقاصد ہیں۔

1- بچوں میں تفریح ..2- تعلیم کا فروغ۔ یونیسیف نے سنہ 1950 کا عشرہ بیماری کے خلاف مہم، سنہ 1960ء کا عشرہ ترقی کا عشرہ، سنہ 1970ء کا عشرہ متبادل کا دور، سنہ 1980ء کا عشرہ بقائے اطفال کی مہم اور سنہ 1990ء کا عشرہ بچوں کے حقوق کا عشرہ قرار دیا۔ جبکہ عالمی ادارہ اطفال یونیسیف کے سالانہ بجٹ کا 29 فیصد بچوں کی صحت اور غذائیت کے لئے، 10 فیصد پینے کے لئے صاف پانی اور حفظان صحت کے لئے، 11 فیصد تعلیم کے لئے، 8 فیصد خاندان اور معاشرے میں عورتوں اور بچوں کے کاموں کے فروغ کے لئے، 15 فیصد پلاننگ اور پروجیکٹ امداد کے لئے اور 27 فیصد ہنگامی امداد کے لئے صرف کیا جاتا ہے۔

دُودھ کی بدولت
ریشم جیسے بال — نرم ملائم کھال
روشن روشن آنکھ — موتی جیسے دانت
کہتے ہیں کہ "صحت مند جسم صحت مند ذہن کی علامت ہے"
ماہرین برسوں کی تحقیق کے بعد دُودھ کو مکمل غذا اور صحت مند جسم کی ضمانت قرار دیتے ہیں۔
اللہ میاں نے دُودھ میں کیلشیم، پروٹین وٹامنز اور بہت سے معدنی اجزا متوازن مقدار میں شامل کر دیے ہیں۔ یہی وہ اجزا ہیں جو اچھی صحت، بیدار ذہن اور خوشگوار زندگی کی ضمانت ہیں۔
اگر آپ نے ہر روز دو گلاس دُودھ پینا اپنی عادت بنالیا تو گویا آپ نے صحت مندی کا راز پالیا۔
دانائی کی بات سنو
دُودھ پیو — مضبوط بنو
اشتہار برائے بہبود اطفال، منجانب آنکھ مچولی۔ کراچی

پیار کے گیت

فاروق قیصر

دنیا بھر کے سب بچے آئیں ساتھ ہمارے
امن دوستی پیار کے گیت گائیں مل کر سارے
ہم کرنیں ہم چاند اور سورج ہم جگنو ہم تارے
ہم کلیاں ہم پھول اور پنچھی رنگ دھنک کے سارے
ننھے منے ہاتھوں سے جگ سکھ سے معمور کریں
جنگ، بھوک، غربت، بیماری اس دھرتی سے دور کریں
کسی کو ہم سب سے دکھ نہ پہنچے یہ اپنا معمول رہے
ہم سے پیار کی برکھا برسے دکھ کی ساری دھول بہے

ہاتھ میں ہاتھ لئے سب میت
امن دوستی پیار کے گیت
گائیں مل کر سارے

دولت

شاہ بلیغ الدین

ایک بے چارہ اللہ کا بندہ تھا جس کا کوئی بچہ نہ تھا۔ صبح و شام وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا کہ "یا رب ایک بیٹا عطا فرما!" مگر اس کی دعا قبول نہ ہوتی تھی۔ ایک دن بہت دل بھر آیا تو خوب رو رو کے دعا مانگی اور کہا کہ .... "اے رب العزت! اگر تو نے مجھے ایک بیٹا عطا فرمایا تو اپنے جسم کے کپڑوں کے علاوہ اور جو کچھ میرے پاس ہے تیری راہ میں لٹادوں گا۔"

اللہ تعالیٰ نے اس شخص کی دعا قبول کرلی اور اسے ایک بیٹا عطا فرمادیا۔ کچھ نہ پوچھئے کہ خوشی سے اس کا کیا حال ہوا۔

جب آدمی کو خوشی ہو تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہی تھا۔ مکے میں آپ فاتحانہ داخل ہوئے تو کجاوے پر آپ کی پیشانی نکی ہوئی تھی اور زبان پر شکر وثنا کے الفاظ تھے۔ چنانچہ اس اللہ کے

نیک بندے نے بھی شکر ادا کیا اور جسم کے کپڑوں کے سوا جو کچھ پاس تھا اس خوشی میں اللہ کی راہ میں لٹا دیا۔ جیسے جیسے دن گزرتے گئے بچہ بڑا ہوتا گیا اور وہ خوشی سے نہال رہنے لگا۔

اس اللہ کے نیک بندے کا ایک دوست تھا۔ اچھے برے وقت کا ساتھی۔ اسے اپنے بے اولاد دوست کے گھر لڑکا پیدا ہونے کی بہت خوشی تھی۔ چنانچہ دن رات اپنے دوست کی خوشی میں شریک رہتا مگر کچھ دنوں بعد اسے ایک کام سے سفر پر جانا پڑا۔

"کام کچھ ایسا تھا کہ وہ برسوں باہر رہا۔ جب لوٹا تو سب سے پہلے اپنے دوست سے ملنے گیا۔ سوچتا تھا کہ ..... میرا دوست تو بہت خوش ہوگا۔ لیکن جب اپنے دوست کے محلے میں پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہ تو جیل میں پڑا ہے۔ اسے بڑی حیرت ہوئی کہ ایسا نیک آدمی جیل کیسے گیا؟ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ لوگوں سے پوچھا ..." کیا بات ہوئی"؟ انہوں نے کہا ..... "تمہیں معلوم ہے اس کا ایک لڑکا تھا؟" اس نے کہا ...... "ہاں!" لوگوں نے کہا ..... "اس بدبخت کی وجہ سے تمہارے دوست کو یہ دن دیکھنا پڑا۔" دوست نے پوچھا۔ "کیوں؟" لوگوں نے کہا۔ "بڑا ہو کر وہ تو بڑا بدمعاش نکلا۔" یہ سن کر مسافر دوست کے منہ پر تالا لگ گیا۔ اس نے سوچا کہ ..." اولاد کے لئے میرا دوست دن رات دعائیں مانگتا تھا۔ اگر ایسا لڑکا اس کی قسمت میں لکھا تھا تو بہت اچھا ہوتا کہ وہ بے اولاد رہتا۔" بچوں کی کیفیت پودوں جیسی ہوتی ہے۔ جیسے مالی دن رات ان کی دیکھ بھال کرتا اور ان کی تراش خراش میں لگا رہتا ہے اسی طرح ماں باپ کو بھی بچے کو اپنی نظروں میں رکھنا چاہیے۔ برا ہو اولاد کی اس محبت کا جو تربیت سے روک دے۔ تربیت سے بڑی نیکی کوئی اور نہیں۔ اولاد کو یہ نہ ملی تو کچھ نہ ملا۔ بے جا سختی اور ضرورت سے زیادہ لاڈ پیار دونوں صورتیں بری ہوتی ہیں۔ ان سے بچنا چاہیے۔

کسی نے ایک بزرگ سے پوچھا ..." اولاد کی تربیت کس طرح کرنی چاہیے؟" انہوں نے کہا کہ اولاد کی سب سے بڑی نگہبانی یہ ہے کہ اس میں اچھے برے کی تمیز پیدا کی جائے۔ بچہ جونہی بولنا شروع کردے، دھیان رکھو کہ گالی اور بری بات منہ سے نہ نکالے۔ بچے میں برائی کا پہلا چسکا گالی سے پڑتا ہے یا جھوٹ سے۔ اسے ابتدا ہی سے ایسی باتیں سکھلایئے جو تہذیب اور شائستگی کی ہوں۔ السلام علیکم، بسم اللہ، الحمدللہ۔ پہلا کلمہ بچے کو چھوٹی سی عمر ہی سے سکھا دینا چاہیے۔ پھر اسے کلام اللہ کی چھوٹی چھوٹی سورتیں یاد کرانی

جواہر پارے

☆ دوسرے پر بھروسہ کرنے والے انسان کی ترقی بہت سست ہوتی ہے۔

☆ کسی چٹان پر اپنی محبت کی بنیاد نہ رکھو۔

☆ ٹھوکر کے لئے تیار رہو تاکہ گرنے سے بچ سکو۔

چاہئیں۔ دس برس کی عمر ہو تو ہر ایرے غیرے کے پاس بیٹھنے اور ملنے جلنے سے روکئے اور اسے نماز کا پابند بنائیے۔ بچہ پڑھنے بیٹھے تو پہلے نرمی سے پڑھائیے۔ جب کچھ چل نکلے تو سختی سے بھی نہ گھبرائیے۔ جہاں تک ہوسکے بچے کو سادگی کا عادی بنائیے۔

بچے دیکھ کے بہت کچھ سیکھتے ہیں اس لئے انہیں صرف ایسی جگہ لائیے، لے جائیے جہاں سے وہ شائستگی اور شرافت کی باتیں سیکھیں۔ بچوں کی تربیت کا بڑا راز یہ ہے کہ والدین کو خود اپنی بھی تربیت کرنی پڑتی ہے۔ انہیں بزرگوں اور استادوں کا ادب سکھانا بہت ضروری ہے، بے ادب بے نصیب اور باادب بانصیب ہوتا ہے۔ انہیں خوب اچھی طرح بتائیے کہ ماں باپ اور استاد خفا ہوں تو یہ خفگی ہمیشہ ان کی بھلائی کے لئے ہوتی ہے۔ بچوں کے کھانے پینے کی سب ضرورتیں خود پوری کیجئے۔ چھوٹی عمر میں روپیہ پیسہ ان کے ہاتھوں میں نہ دیجئے۔ اس سے بہت سی برائیاں پیدا ہوتی ہیں۔

دنیا کی ہر دولت چلتی پھرتی چھاؤں ہے۔ ہاں، علم کی دولت وہ ہے جو نہ کم ہوتی ہے نہ چوری ہوتی ہے۔ اس لئے اولاد کے واسطے مکان، زمین، دولت اور موٹریں نہ چھوڑیئے، بلکہ علم و ہنر کی دولت چھوڑیئے۔

☆ --- ☆ --- ☆

مقابلہ نمبر

میں ہونے والے مقابلوں کے نتائج کا آپ کو بے چینی سے انتظار ہوگا۔ لیکن چند تکنیکی وجوہات کی بنا پر یہ نتائج اس شمارے میں شامل نہیں کئے جاسکے۔ انہیں آپ آئندہ اشاعت میں ملاحظہ کرسکیں گے۔ انشاءاللہ۔

آنکھ مچولی کے "اطفالِ پاکستان نمبر" کو پُراثر تحریروں اور خوب صورت نظموں کے ساتھ ساتھ معلوماتی اور موضوعاتی فلرز سے بھی سجایا گیا ہے۔ ان فلرز میں اعداد و شمار بھی ہیں اور تصویر کشی بھی۔ فلرز کا زیادہ تر معلوماتی مواد آنکھ مچولی کی ایک قلمکار ساتھی نسرین شاہین صاحبہ نے فراہم کیا ہے۔ ادارہ ان کے اس تعاون کے لئے شکر گزار ہے۔

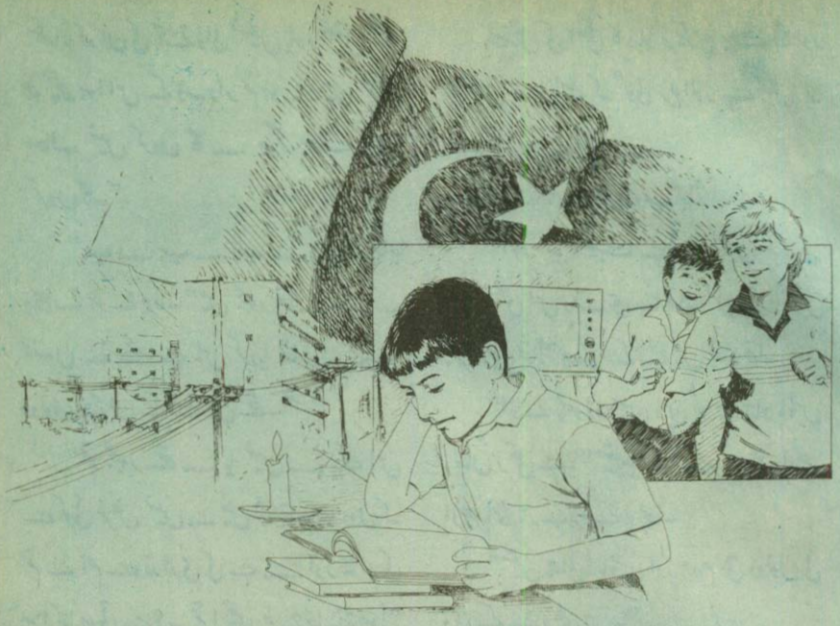

چوری کی کوشش

ابو غازی محمد

"تم نے تو یہ سمجھا تھا کہ قانون کی پناہ میں ہوتے ہوئے میرے ہاتھ تم تک نہیں پہنچ سکیں گے ..... ساجے تم شاید یہ نہیں جانتے تھے کہ سیتال کے ہاتھ قانون سے بھی لمبے ہیں ..... وہ جب چاہے ..... جیسے چاہے اپنے شکار تک پہنچ سکتا ہے!..... اس کے شکنجے سے بچ کر نکل جانا ..... آسان نہیں ...... بہت مشکل ہے ساجے! .... بہت مشکل ہے!!!"

مکروہ صورت شخص شعلہ بار نظروں سے اسے گھورتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"میرا سارا منصوبہ خاک میں مل گیا ہے!...... صرف اور صرف تمہاری وجہ سے ..... اگر تم غداری نہ کرتے تو اسلحہ کی اتنی بڑی کھیپ کبھی نہ پکڑی جاتی اور ..... آج میرے درندے گلی گلی موت تقسیم کر رہے ہوتے اور ..... میں اس ملک کے وفاداروں کو ایسا عبرت ناک سبق

سکھاتا کہ ان کی آنے والی نسلیں یاد رکھتیں لیکن جو کچھ ہوا اس کے ذمہ دار تم ہو..... میں تمہیں معاف نہیں کروں گا ..... ہرگز معاف نہیں کروں گا۔"

"بب ..... بب ..... بب ..... باس!" ساجا ہکلاتے ہوئے بولا۔ "میں مجبور تھا..... باس .... انہوں نے مجھے بے بس کردیا تھا ..... میرے دونوں بچے ان کے قبضے میں تھے۔"

"تم مجبور تھے ..... یا نہیں ..... مجھے اس سے کوئی غرض نہیں .... میں تو اتنا جانتا ہوں کہ تم نے ہم سے غداری کی ہے ..... اور غدار کی سزا کیا ہوتی ہے؟ یہ تم اچھی طرح جانتے ہو!" سینتال نے غصے سے دانت پیستے ہوئے کہا اور اگلے لمحہ اس نے ریوالور کا رخ نیچے گرے ساجے کی طرف کردیا۔

"ر ..... رحم .... باس خدا کے لئے مجھ پر رحم کرو.... مجھے ایک موقع .... صرف ایک موقع اور دے دو۔" ساجا گڑگڑایا۔

"آہاہاہا!" سینتال قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ "موقع .... موقع تو اسے دیا جاتا ہے جس سے انجانے میں غلطی ہو..... اور تم نے تو سب کچھ جان بوجھ کر کیا ہے .... تمہیں موت دے سکتا ہوں..... موقع نہیں۔"

سینتال کی انگلی کا دباؤ ٹریگر پر بڑھنے لگا اور پھر اس سے پہلے کہ گولی ریوالور سے نکل کر ساجے کا سینہ چیر ڈالتی.....

کمرہ اچانک تاریکی میں ڈوب گیا!

"افوہ! کیا مصیبت ہے! ..... اس کمبخت بجلی کو بھی اس وقت ہی جانا تھا۔ کس قدر تجسس بھرا سین تھا!" عمیر کے لہجے میں غصہ تھا۔

"ارے چھوڑو سین وین کو .... بتاؤ ماچس کہاں رکھی ہے؟" متین نے اندھیرے میں ادھر ادھر ہاتھ مارتے ہوئے پوچھا۔

"متین بھائی! ماچس اور موم بتی دونوں ٹی وی کے نیچے رکھی ہیں۔"

منو کی آواز سنائی دی۔

تمہارے خیال میں کیا سینتال نے ساجے کو مار دیا ہوگا؟"

متین نے موم بتی جلاتے ہوئے' عمیر سے پوچھا۔

"مجھے کیا پتہ یار ..... ساجا مرگیا ہے یا زندہ ہے ..... یہ تو بجلی بند کرنے والوں کو پتہ ہوگا۔ جو ہمیں اندھیرے میں بٹھا کر خود روشنی میں مزے سے ٹی وی دیکھ رہے ہوں گے۔" عمیر کا موڈ ابھی تک خراب تھا۔

"ابھی پورے چالیس منٹ کا ڈرامہ باقی ہے

..... وہ دیکھو سامنے والے گھر میں بجلی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ ایک فیز آف ہوا ہے۔ اگر ہم چاہیں تو باقی کھیل دیکھ سکتے ہیں۔" متین نے دروازے سے باہر دیکھتے ہوئے انکشاف کیا۔

"وہ کیسے بھئی؟" عمیر کی آنکھوں میں حیرت سمٹ آئی تھی۔

"ابھی بتاتا ہوں۔" متین نے کہا اور پھر تیزی سے اسٹور روم کی طرف لپکا۔

اور پھر پانچ منٹ بعد وہ گھر جو کچھ دیر پہلے اندھیرے میں ڈوبا نظر آرہا تھا ایک بار پھر روشنی سے جگمگاتا دکھائی دے رہا تھا۔

"واہ یار کیا ترکیب نکالی ہے تم نے!..... کس سے سیکھا ہے یہ ہنر؟" عمیر کے لہجے میں خوشی جھلک رہی تھی۔

"اپنے دوست عمران سے .... جب بھی بجلی جاتی ہے تو وہ لوگ کنڈا ڈال کر کام چلاتے ہیں۔" متین ٹی وی کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولا۔

"ارے یہ منو کہاں چلا گیا؟" عمیر نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

"اگر یہاں نہیں ہے تو ظاہر ہے دوسرے کمرے میں ہوگا..... خود ہی آجائے گا.... چھوڑو اسے ..... آؤ ڈرامہ دیکھو۔" متین نے اسکرین پر نظریں جمائے ہوئے جواب دیا۔

ڈرامہ ختم ہوا تو انہیں پھر منو کی یاد آگئی۔

"وہ منو آخر ہے کہاں؟"

"آؤ دیکھتے ہیں۔" متین نے کہا۔

دونوں منو کو ڈھونڈتے ہوئے اسٹڈی روم تک پہنچ گئے۔

کھڑکی سے اندر کا منظر دیکھنے کے بعد دونوں نے حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اسٹڈی روم کی لائٹ بند تھی اور منو موم بتی کی روشنی میں اندر بیٹھا کچھ لکھنے میں مصروف تھا۔

وہ دونوں غیر محسوس انداز میں دروازہ کھول کر دبے پاؤں چلتے ہوئے اندر آگئے۔

"منے میاں! جب گھر میں بجلی ہے تو موم بتی کی روشنی میں آنکھیں خراب کرنے کی کیا ضرورت ہے تمہیں۔" عمیر اس کے کان کے قریب منہ لے جاکر اچانک بولا۔

منو نے لکھتے لکھتے نظریں اٹھا کر عمیر کی طرف دیکھا اور پھر دوبارہ لکھنے میں مصروف ہوگیا۔

متین لائٹ آن کرنے کے ارادے سے سوئچ بورڈ کی طرف بڑھا ہی تھا کہ منو کی آواز کمرے میں گونجی

"متین بھائی لائٹ نہ جلائیں۔"

"کیوں بھئی؟" متین نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا

"بس میں نے کہہ جو دیا کہ لائٹ نہ جلائیں۔"

"اچھا تو آؤ پھر دوسرے کمرے میں چلتے ہیں۔" عمیر اٹھتے ہوئے بولا۔

"نہیں میں یہیں ٹھیک ہوں۔"

"عجیب بے وقوف لڑکا ہے' اندھیرے سے آنکھیں پھوڑنے پر تلا ہوا ہے۔" متین جھنجھلا گیا۔

"آپ مجھے بے وقوف کہہ سکتے ہیں اور میری آنکھوں پر اثر بھی پڑ سکتا ہے لیکن ...." "لیکن کیا؟" متین اور عمیر دونوں نے ایک ساتھ پوچھا۔ "لیکن یہ کہ چوری کی جگمگ جگمگ کرتی روشنی سے میری اپنی یہ چھوٹی موم بتی کہیں بہتر ہے۔ وہ عقل مندی کس کام کی جو اپنے گھر کو روشن کرنے کے لئے اپنے ہی ملک کو اندھیروں میں جھونک دے۔"

کمرے کی فضا میں سناٹا چھا گیا تھا۔ متین اور عمیر دونوں کی نظریں موم بتی کے ننھے سے شعلے پر جمی ہوئی تھیں۔ انہیں محسوس ہو رہا تھا کہ یہ ننھا سا شعلہ دُور تک روشنی پھیلا رہا ہے اور اس روشنی میں انہیں اپنا چھوٹا بھائی بھی بڑا نظر آ رہا تھا' بہت بڑا۔

علم پھیلاؤ

جس طرح ہر کام کے کچھ نہ کچھ مقاصد ہوتے ہیں اسی طرح تعلیم کے بھی درج ذیل مقاصد ہیں:

☆ اللہ تعالیٰ کو پہچاننا اور اس کی خوشنودی (رضا) حاصل کرنا۔

☆ طلبہ میں ایمان تقویٰ اور احسان جیسی خوبصورت صفات پیدا کر کے ان کے کردار کی تعمیر کرنا۔

☆ کائنات کے مادی ذرائع اور وسائل پر تحقیق کرنا اور انہیں بنی نوع انسان کے استعمال کے قابل بنانا۔

☆ طلبہ میں حب الوطنی کا جذبہ بیدار کرنا۔

☆ طلبہ کو اپنے قومی ورثہ سے روشناس کرانا تاکہ ان کے ذہن میں اپنی تہذیب کے متعلق فخر کا احساس پیدا ہو۔

☆ ان میں زندگی کے مسائل کو اچھے انداز میں حل کرنے کی اہلیت پیدا کرنا۔

ابھی تک دن نہیں نکلا

نوید مرزا

کئی صدیوں کی تاریکی رگ و پے میں اتر جائے
تو سانسیں جلنے لگتی ہیں
کئی برسوں پرانا شب کا سناٹا
نظر میں آ کے رک جائے
تو آنکھیں جلنے لگتی ہیں
ذرا سی دیر کو سورج نکل کر ڈوب جائے
تو عجب احساس ہوتا ہے
ہمیں کیوں قطرہ قطرہ
روشنی کے رنگ ملتے ہیں
میں اکثر سوچتا ہوں ہم کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں
دو قدم چلنا بھی دُوبھر ہے
ہمارے قائداعظم تمہیں آواز دیتے ہیں
تمہی نے تو ہمیں گرداب سے باہر نکالا تھا
نئی کرنوں نے تاریکی سے اپنا سر نکالا تھا
مگر ہم پھر وہیں پر آ گئے ہیں
جس جگہ زنجیر پا تھے بے وطن تھے
کتنے لاشے بے کفن تھے
اب وہی صدیوں پرانا
تیرگی کا زہر ہم پر کیوں مسلط ہے
ہمیں محسوس ہوتا ہے ابھی تک دن نہیں نکلا

مُسلمان کے مُسلمان پر حقوق

نبی صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے فرمایا:

"ایک مُسلمان کے دوسرے مُسلمان پر چھ حقوق ہیں"۔ پوچھا گیا یارسول اللہ! وہ کیا ہیں؟۔ آپؐ نے فرمایا "جب تم مُسلمان بھائی سے ملو تو اُس کو سلام کرو، جب وہ دعوت دینے کے لئے مدعو کرے تو اُس کی دعوت قبول کرو، جب وہ تم سے نیک مشورے کا طالب ہو تو اُس کی خیر خواہی کرو اور نیک مشورہ دو، جب اُس کو چھینک آئے اور وہ الحمد للہ کہے تو اُس کے جواب میں یرحمک اللہ کہو، جب وہ بیمار پڑ جائے تو اُس کی عیادت کرو اور جب وہ مر جائے تو اس کے جنازے کے ساتھ جاؤ۔"

(مُسلم)

عطیہ اشتہار

حاجی فتح محمد میموریل آرگنائزیشن

۷، حسن لشکری اسٹریٹ، بادشاہی روڈ کراچی

۸۷، بلاک نمبر ۷، خانیوال

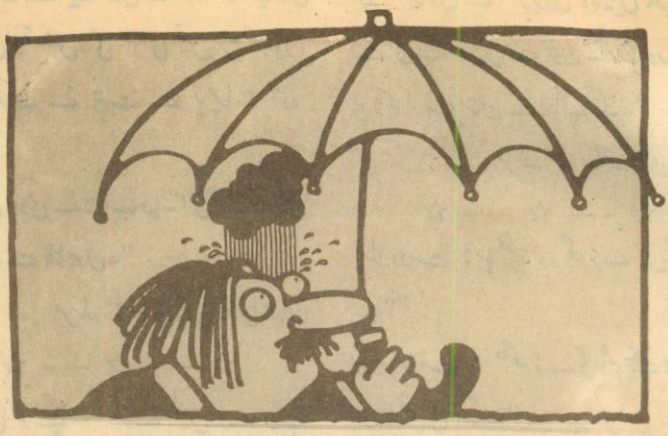

لطیفے شطیفے

جج : تم قبول کرتے ہو کہ تم نے کپڑے کی ایک دکان پر پانچ بار چوری کی، کیا چرایا۔

چور : "صرف ایک ساڑھی حضور!"

جج : "لیکن ساڑھی کے لئے پانچ بار چوری کرنے کی کیا ضرورت تھی۔"

چور : "چار بار ساڑھی میری بیوی کو پسند نہیں آئی تھی جناب۔"

مرسلہ : طاؤد بلوچ، پسنی مکران

بیٹا : "ابا جان آپ تو کہتے ہیں کہ اپنے سے چھوٹوں کو مارنا بہت بری بات ہے۔"

والد : "ہاں بیٹا یہ تو بہت ہی بری بات ہے۔"

بیٹا : "تو ابا جان یہ بات آپ ہمارے ماسٹر صاحب کو کیوں نہیں سمجھاتے ہیں وہ تو چھوٹے چھوٹے بچوں کی پٹائی کرتے رہتے ہیں۔"

مرسلہ : طاؤد بلوچ، پسنی مکران

☆ --- ☆ --- ☆

ک کلرک سے ایک آدمی نے کہا۔ "جناب میں
ی وژن لائسنس کی آدھی فیس جمع کراؤں
۔" کلرک نے حیرت سے پوچھا : "وہ
وں؟"

اس آدمی نے جواب دیا۔"اس لئے کہ میں
ک آنکھ سے کانا ہوں۔"

مرسلہ : طاؤد بلوچ، پسنی مکران

☆ --- ☆ --- ☆

آنٹی کو بچے سونے نہیں دے رہے
تھے۔

صائمہ تم دوپہر میں سوتی ہو؟" آنٹی نے پوچھا۔

میں نے نفی میں سرہلادیا۔ "ہاں بھئی یہ نئی
ل تو سوتی ہی نہیں۔" آنٹی نے دادی اماں سے
ہا۔

ں فوراً" بولی۔"اس لئے کہ اسے پتہ ہے کہ پرانی
ل پہلے ہی بہت سو چکی ہے۔"

مرسلہ : صائمہ یٰسین، کراچی

☆ --- ☆ --- ☆

"ہندوستان سے انگریزوں کو کس طرح نکالا
یا؟" اس کا جواب ایک بچے نے اس طرح
ھا۔

"انگریز مسلمانوں اور ہندوؤں کو روٹی کی
ائے ڈبل روٹی کھانے کو کہتے تھے اس لئے ہندو
اور مسلمانوں نے انگریزوں کو چپلیں ماریں جس
سے ان کے سر میں سے خون نکلنے لگا اور وہ سر پر
پیر رکھ کر ہندوستان سے بھاگ گئے۔"

مرسلہ : صائمہ یٰسین، کراچی

☆ --- ☆ --- ☆

پہلا دوست : ہاتھی اور گھوڑے میں کیا فرق
ہے؟"

دوسرا دوست : "گھوڑے کی دُم پیچھے ہوتی ہے
اور ہاتھی کی آگے۔"

مرسلہ : سعید اکبر چنگان پنجگور

☆ --- ☆ --- ☆

پہلا دوست : (دوسرے سے)"اب میں کبھی
شرط نہیں لگاؤں گا۔"

دوسرا دوست : "رہنے دو تم کبھی اپنی بات پر
قائم رہے ہو۔"

پہلا دوست : "ایسی بات ہے تو لگالو شرط۔"

مرسلہ : سعید اکبر چنگان، پنجگور

☆ --- ☆ --- ☆

ایک شخص مچھر مارنے والی دوا کی دوکان پر
گیا۔ دوکاندار نے پانچ روپے لے کر ایک ڈبہ
پکڑا دیا۔ گھر جاکر اس نے ڈبہ کھولا ڈبے میں سے
دو پتھر اور ایک پرچی نکلی۔ پرچی پر لکھا تھا۔
"ایک پتھر پر مچھر رکھ کر دوسرے پتھر سے ماریں۔

ہیں؟"

مرسلہ: شمیم بیگم، کراچی

☆ --- ☆ --- ☆

ریڈیو سے بیک وقت دو اسٹیشن بول رہے تھے۔ ایک سے ورزش کرنے کا طریقہ اور دوسرے سے تلاش گمشدہ کا اعلان ہو رہا تھا۔ الفاظ آپس میں گڈمڈ ہوگئے تو یہ صورت بنی۔

"سب سے پہلے لمبے لمبے سانس لیں۔ رنگ گورا، عمر ۲۵ سال اور بائیں کان کو پکڑ کر جھک جائیں۔ گم ہوگیا ہے۔ پھر سیدھے کھڑے ہو کر تلاش کرنے والے کو ۵۰۰ روپے انعام ملے گا۔ جس کو بھی ملے۔ وہ سر نیچے اور دونوں ٹانگیں اوپر اٹھالیں۔ قریبی پولیس اسٹیشن پر اطلاع دیں یا مندرجہ ذیل پتہ پر۔ گردن گھمایئے الٹا لیٹ جایئے۔ الٹا لیٹے لیٹے فون نمبر دائیں گھومیں پھر بائیں گھومیں۔"

مرسلہ : محمد عمر قریشی، اسلام آباد

☆ --- ☆ --- ☆

"میرے پڑوسی نے مجھے دھمکی دی ہے کہ اگر میں نے رات کو زور سے ریڈیو بجانے پر آئندہ اسے ٹوکا تو وہ اپنی ٹانگ سے میرا سر توڑ دے گا۔"

"مگر وہ ٹانگ سے آپ کا سر کیسے توڑ سکتا ہے؟"

ان صاحب نے ایک آہ بھری، پھر کہا۔

"جناب اس کی ایک ٹانگ لکڑی کی ہے۔"

مرسلہ : ہما عثمان، کراچی

☆ --- ☆ --- ☆

یاسر اور عرفان آپس میں باتیں کر رہے تھے یاسر نے کہا۔ "میرے ابو نے ایک ایسا ایئرکنڈیشنر ایجاد کیا ہے جس کو اگر گھر میں چلا دیا جائے تو گھر میں برف جم جاتی ہے۔"

عرفان : "اور میرے ابو نے ایک ایسا پنکھا ایجاد کیا ہے کہ جس کو اگر گھر میں چلا دیا جائے تو آندھی آجاتی ہے۔"

یاسر : "ایسا تو نہیں ہو سکتا!!"

عرفان : "اگر تم برف پگھلاؤ تو میں آندھی بند کردوں گا۔"

مرسلہ : چوہدری افتخار احمد خضر، جھنگ

☆ --- ☆ --- ☆

مجسٹریٹ : (ملزم سے) "اگر تمہارا کوئی وکیل ہے تو اسے حاضر کرو۔"

ملزم : "جناب میرا وکیل کوئی نہیں ہے کیونکہ میں بالکل سچا واقعہ بیان کرنے والا ہوں۔"

مرسلہ : رامین قاضی، بفرزون

مچھر فوراً" مرجائے گا۔"

مرسلہ : ثاقب حبیب فراز' پنڈی سیدپور

☆ --- ☆ --- ☆

ایک مرتبہ ایک دیہاتی گاؤں سے کسی کام کے سلسلہ میں شہر آیا ہوا تھا۔ جب وہ دیہاتی شہر کے کسی علاقے سے گزر رہا تھا تو اس علاقے کے لڑکوں نے دیہاتی کو تنگ کرنا شروع کردیا۔ دیہاتی کے سر کے بال کافی بڑھے ہوئے تھے۔ ایک لڑکے نے دیہاتی سے کہا کہ "تمہارے بال تو ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے گھاس کا گٹھا ہو۔"

دیہاتی فوراً" بولا۔ "میں بھی تو حیران ہوں کہ آخر یہ گدھے میرے ساتھ ساتھ کیوں چل رہے ہیں۔"

مرسلہ : محمد شعیب طاہر

☆ --- ☆ --- ☆

مسز عائشہ اپنے بیٹے کو جھنجھوڑ رہی تھی۔ "اسکول کا وقت ہوگیا ہے۔ جلدی اٹھو تمہیں اسکول جانا ہے۔"

"ممی میں اسکول نہیں جاؤں گا مجھے اسکول سے نفرت ہے۔ بچے مجھے پسند نہیں کرتے۔ استانیاں مجھ سے نفرت کرتی ہیں۔ پورا اسٹاف مجھ سے نفرت کرتا ہے۔" "مگر تمہیں اسکول جانا ہے۔" اس کی ممی نے کہا۔ "تم اب بچے نہیں ۴۵ برس کے ہو اور اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہو۔"

مرسلہ : محمد عمر قریشی' اسلام آباد

☆ --- ☆ --- ☆

ایک بچے نے اپنی دادی سے پوچھا : "دادی اماں دادی اماں آپ کے منہ میں دانت ہیں۔"

دادی اماں نے جواب دیا۔

"نہیں بیٹا"

بچہ معصومیت سے بولا "تو پھر آپ میرے اخروٹ چھپالیں۔

مرسلہ : محمد عمر قریشی' اسلام آباد

☆ --- ☆ --- ☆

ایک فقیر (بیگم صاحبہ) آپ کے پاس بھوکے کے لئے کھانا ہے؟"

بیگم صاحبہ : "ہاں ہے مگر وہ بھوکا ابھی دفتر سے نہیں آیا۔"

مرسلہ : ملیحہ معین الدین

☆ --- ☆ --- ☆

ماں (بچے سے) تمہیں معلوم ہے بڑے جھوٹ بولیں تو کیا ہوتا ہے؟

بچہ : "ہاں اماں! پھر ان کے بچے بس میں آدھے ٹکٹ پر سفر کرتے ہیں"۔

ساجد خان، کراچی۔

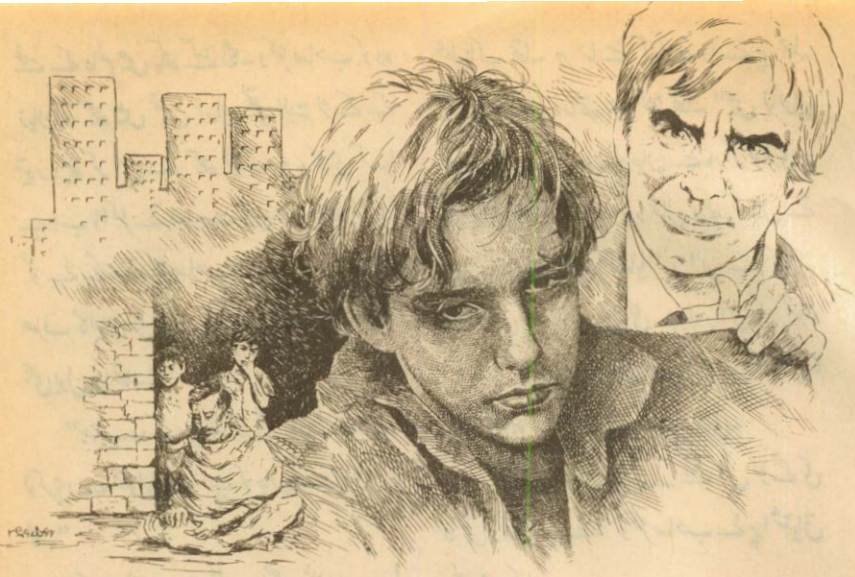

تھپڑ کا وار

فاروق حسن چانڈیو

"او ....." وکٹر صاحب کے منہ سے کراہ خارج ہوئی۔ اس نے جھٹکے سے مڑ کر تھپڑ مارنے والے کو دیکھا۔

"جناب! میں معافی چاہتا ہوں .... دراصل یہ خطرناک پاگل نہیں تھا۔ پہلی دفعہ اس نے یہ حرکت کی ہے۔" پاگل خانے کے ڈاکٹر نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ اس نے ایک پندرہ سال کی عمر کے لڑکے کو پکڑا ہوا تھا۔ اسی وقت ایک محافظ بھاگتا ہوا آیا اور تھپڑ مارنے والے لڑکے کو پکڑ کر ایک طرف گھسیٹتا ہوا لے گیا۔

وکٹر ایک بین القوامی ادارے کا افسر تھا۔ وہ پاکستان کے پاگل خانوں کا سروے کرنے آیا ہوا تھا۔ اس وقت وہ گدو بندر حیدر آباد کے پاگل خانے میں تھا۔ جب وہ بچوں کے حصوں میں پہنچا تو اچانک پیچھے سے ایک پاگل لڑکے نے اس پر حملہ کردیا اور زوردار تھپڑ مار کر اپنی زبان میں

ے کے عالم میں کچھ کہنے لگا۔ وکٹر صاحب کو وہ
بان تو سمجھ میں نہیں آرہی تھی البتہ لڑکے کے
یور دیکھ کر اس نے سمجھ لیا کہ وہ بدکلامی کررہا
ہے جب ڈاکٹر نے معذرت کرلی اور محافظ لڑکے
کو لے گئے تو وکٹر صاحب نے پوچھا۔ "وہ لڑکا
صرف گالیاں ہی دے رہا تھا یا کچھ بامعنی الفاظ
بھی بول رہا تھا۔"

"جناب وہ کہہ رہا تھا کہ اگر آپ نے اسے
نوکری سے نکلوایا تو وہ آپ کو جان سے مار ڈالے
گا۔"

"کیا مطلب .....!! وہ پاگل نہیں .....!
یہاں نوکری کرتا ہے.....!!!"
وکٹر صاحب نے حیران ہو کر کہا۔

"وہ پاگل ہی ہے ..... مگر میں نے مصلحتاً"
اسے باور کرا دیا تھا کہ اس کی یہاں پر نوکری ہے
اور اس کی تنخواہ اس کے گھر بھیج دی جاتی
ہے۔" ڈاکٹر نے وضاحت کی۔

یہ سن کر وکٹر صاحب کو اس پاگل لڑکے کا
معاملہ دلچسپ محسوس ہوا کیونکہ وہ اپنی رپورٹ
میں اہم اور دلچسپ حالات ضرور قلم بند کرتا تھا۔
اس نے ڈاکٹر سے پوچھا۔ "اسے کیوں باور کرایا
گیا کہ اس کی یہاں نوکری ہے؟"

"وہ جب شروع میں یہاں لایا گیا تھا تو بہت
خطرناک تھا۔ ہر سامنے آجانے والے پر حملہ
کردیتا تھا اور ساتھ ہی کہتا تھا۔ "میں نوکری
کروں گا ..... تم سب کو جان سے مار کر نوکری پر
چلا جاؤں گا....." "یہ صورتحال دیکھ کر میں نے
اس پر نفسیاتی حربہ آزمایا اور اس سے کہا کہ
یہاں اس کو نوکری دی گئی ہے اور اس کی تنخواہ
اس کے گھر پر بھیج دی جاتی ہے یہ بات سن کر اس کا
غصہ ختم ہوگیا۔" ڈاکٹر نے تفصیل بتائی۔

"دلچسپ کیس ہے ..... مجھے اس لڑکے کی
فائل دکھائی جائے۔" وکٹر صاحب نے پراشتیاق
لہجے میں کہا۔

فائل میں لڑکے کا کوئی نام نہیں تھا۔ نام کی
جگہ ۵۳۰ نمبر لکھا ہوا تھا۔ اسے کراچی کے ایک
تھانے کی طرف سے مجسٹریٹ کے حکم سے پاگل
خانے میں داخل کیا گیا تھا۔ تھانے کی رپورٹ
میں لکھا گیا تھا کہ وہ نامعلوم مقام کا آوارہ
خطرناک پاگل ہے۔ اکثر خوش لباس لوگوں پر
پتھراؤ کرتا ہے یا کوئی ڈنڈا اٹھا کر حملہ کردیتا ہے۔
وکٹر صاحب نے تفصیل پڑھ کر اپنی نوٹ بک پر
تھانے کا نام اور رپورٹ نمبر درج کیے ساتھ ہی
اپنے کیمرے سے فائل میں موجود لڑکے کی تصویر
کا فوٹو بنایا۔ اس کے بعد ڈاکٹر کے ساتھ جاکر اس
لڑکے کی بھی کئی تصویریں کھینچیں اس وقت وہ

لاک اپ میں بند تھا اور چیخ چیخ کر کچھ کہے جارہا تھا۔ اس کام سے فارغ ہو کر وکٹر صاحب نے پورے پاگل خانے کا دورہ کیا اور وہاں سے رخصت ہوگیا۔ اس نے دل میں ارادہ کرلیا تھا کہ اس پاگل لڑکے کے اصل حالات معلوم کرنے کی کوشش کرے گا۔ ویسے اس کا نام و پتہ معلوم نہ ہونے کی وجہ سے وہ کام تقریباً" ناممکن ہی لگ رہا تھا۔ پھر بھی اس نے اپنی سی کوشش کرنے کا عزم کرلیا۔ وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ "اس کو پڑنے والے تھپڑ کا کیا راز ہے؟ لڑکے کو نوکری سے اتنی دلچسپی کیوں ہے؟"

دوسرے دن وکٹر صاحب متعلقہ تھانے پہنچ گیا۔ اس نے ہیڈ محرر سے پاگل لڑکے کی فائل طلب کی۔

ہیڈ محرر نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہا۔ "صاحب! سرکاری ریکارڈ ہم کسی کو نہیں دکھا سکتے۔" پھر اردو میں کہا۔ "لگتا ہے تو بھی کوئی پاگل ہے کہ مفت میں تھانے سے معلومات مانگ رہا ہے۔"

"تمہارا افسر کہاں ہے میں اس سے ملنا چاہتا ہوں...." وکٹر صاحب نے پوچھا۔

"کیا میں تم کو افسر نظر نہیں آتا!؟" ہیڈ محرر نے تلخ لہجے میں کہا۔

"میرا مطلب ہے اس تھانے کا انچارج کون ہے؟"

ایک سپاہی وکٹر صاحب کو ایس ایچ او کے پاس لے گیا۔ ایس ایچ او اس سے بہت خوش اخلاقی سے ملا کیونکہ اس نے اس کی جیب پر لگا ہوا بین الاقوامی ادارے کا کارڈ دیکھ لیا تھا۔ اس نے کھڑے ہو کر وکٹر صاحب سے مصافحہ کیا اس کے بعد کرسی پیش کی۔ چند رسمی کلمات کے بعد وکٹر نے اپنی آمد کا مقصد بتایا۔ پھر تقریباً" دس منٹ بعد اردلی نے ایک فائل لاکر اس کے سامنے رکھ دی۔ وکٹر صاحب نے فائل کو بغور پڑھا۔ تقریباً" وہی معلومات تھیں۔ جو وہ پاگل خانے کی فائل سے پڑھ چکا تھا البتہ فائل میں ایک شخص اویس احمد کی طرف سے پاگل لڑکے کے خلاف درخواست تھی۔ اویس احمد نے شکایت کی تھی کہ وہ پاگل لڑکا بہت خطرناک ہے۔ کئی دفعہ اس پر پتھراؤ کرچکا ہے۔ آخر میں اویس احمد کا نام اور پتہ درج تھا۔ وکٹر صاحب نے اویس احمد کا پتہ نوٹ کیا اور فائل واپس کرکے ایس ایچ او کا شکریہ ادا کرکے رخصت ہوگیا۔

اس نے تھانے سے نکل کر ٹیکسی ڈرائیور کو اویس احمد کے پتے پر چلنے کا کہا۔ اویس احمد گھر پر ہی موجود تھا۔ وہ بہت ہی بااخلاق اور مہمان نواز

ثابت ہوا۔ وکٹر صاحب نے اس سے پاگل لڑکے کا اتا پتا معلوم کرنا چاہا تو جواب میں اویس احمد نے اسے بتایا کہ وہ پاگل لڑکے کے پتے سے تو واقف نہیں ہے۔ البتہ اسے ایک دفعہ ہوش مندی کی حالت میں "ایم ایس ٹی" قالین فیکٹری میں دیکھ چکا ہے۔ اس نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ "میں بچوں کی مزدوری کے خلاف کام کرنے والے ادارے کا فیلڈ افسر ہوں۔ ایک دفعہ مجھے اطلاع ملی تھی کہ "ایم ایس ٹی" مل میں بچوں سے مزدوری کروائی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں مل پر چھاپہ مارا تو وہاں بہت سے بچوں کے ساتھ اس پاگل لڑکے کو بھی دیکھا تھا۔ اس پاگل لڑکے نے میری بہت خوشامد کی تھی کہ اسے نوکری سے نہ نکلوایا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے اس کی شکل یاد رہ گئی تھی اور شاید یہی وجہ ہو سکتی ہے کہ پاگل پن کی حالت میں ہی وہ مجھے دور سے دیکھ کر بھڑک اٹھتا تھا اور مجھ پر پتھراؤ کر دیتا تھا۔ میں نے دو مرتبہ تو صبر کر لیا مگر تیسری دفعہ جب میں اچھا خاصا زخمی ہو گیا تو میں نے تھانے جا کر رپورٹ کر دی۔"

"مجھے اس لڑکے کے پاگل ہونے کی وجہ معلوم کرنی ہے اور اصل وجہ اس کے گھر سے ہی معلوم ہو سکتی ہے۔ کیا آپ اس سلسلے میں میری کسی طرح مدد کر سکتے ہیں۔" وکٹر نے امید بھرے لہجے میں کہا۔

"بالکل بالکل .... چلیں ابھی ابتداء کرتے ہیں..... یقیناً" ایم ایس ٹی مل کے ریکارڈ میں اس کا پتہ لکھا ہو گا۔" اویس احمد نے فوراً" حامی بھرتے ہوئے کہا۔

مل والوں نے لڑکے کی تصویر دیکھ کر اسے پہچان لیا۔ انہوں نے لڑکے کا نام تنویر بتایا اور ریکارڈ سے دیکھ کر اس کے گھر کا پتہ لکھ دیا جو کہ ایک کچی آبادی کا مبہم سا پتہ تھا۔

اگلے دن اویس اور وکٹر صاحب نے کچی آبادی جا کر پاگل تنویر کا گھر تلاش کرنا شروع کیا۔ مگر پتہ مبہم ہونے کی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکے۔ اب اویس نے سوچا کہ سرکاری اسکول جا کر معلوم کرنا چاہیے۔ وہاں ہر محلّے کے بچے ہوں گے۔ اس لئے ممکن ہے کہ وہاں سے پتہ معلوم ہو سکے۔ دونوں اسکول جا کر ہیڈ ماسٹر صاحب سے ملے اور اپنی آمد کا مقصد بیان کیا۔ ہیڈ ماسٹر تصویر دیکھ کر چونک پڑے اور پھر بڑی حسرت سے کہا۔ "کیا یہ لڑکا .... تنویر پاگل ہو گیا ہے....!!! افسوس ..... پاکستان مستقبل کے عظیم سائنس دان سے محروم ہو گیا.....!!"

"کیا مطلب .....! مستقبل کا سائنس دان!!"

!!!" وکٹر صاحب نے حیران ہو کر کہا۔

"جی ہاں ..... یہ لڑکا ہمارے اسکول کا ذہین ترین طالب علم تھا۔ فارغ پیریڈ اور وقفے میں بھی لیبارٹری میں بیٹھ کر کچھ نہ کچھ کرتا رہتا تھا۔ اس نے اس سلسلے میں مجھ سے خاص طور پر اجازت لے لی تھی۔ اس کی ذہانت اور شوق کو دیکھ کر میں نے بھی اجازت دے رکھی تھی۔ ایک دن اس نے شیشے کی عام بوتل سے ایک انوکھا بلب ایجاد کر کے تمام اساتذہ کو حیران کر دیا تھا۔ اس بلب کی خوبی یہ تھی کہ اسے صرف ایک لمحے کے لئے بجلی کی یا بیٹری سیل کی ضرورت پڑتی تھی۔ اس کے بعد ایک گھنٹے تک وہ خود ہی جلتا رہتا تھا۔ تنویر نے دعویٰ کیا تھا کہ وہ مزید تجربات کر کے بلب کے روشن رہنے کا دورانیہ بارہ گھنٹے تک کر دے گا۔ اس ایجاد کے ایک ماہ بعد تنویر نے اسکول آنا بند کر دیا پھر دو ماہ بعد آ کر اس نے بتایا کہ وہ مزید پڑھائی جاری نہیں رکھ سکتا۔ میں نے اس سے وجہ معلوم کرنے کی بہت کوشش کی مگر اس نے مکمل طور پر خاموشی اختیار کر لی تھی۔ مجھے افسوس تو بہت ہوا مگر ظاہر ہے میں اسے زبردستی پڑھائی جاری رکھنے کے لئے مجبور نہیں کر سکتا تھا۔ اس طرح اس نے میٹرک ہی میں تعلیم ادھوری چھوڑ دی تھی۔"

"آپ کو اس کے گھر کا پتہ تو معلوم ہو گا .....!" وکٹر صاحب نے بڑی بے تابی کے ساتھ فوراً پوچھا۔

"اس کچی آبادی کے گھروں کے باقاعدہ نمبر نہیں ہیں۔ اس لئے ریکارڈ سے پتہ معلوم نہیں ہو سکتا۔ البتہ کوئی بچہ اس کے گھر سے ضرور واقف ہو گا۔ آپ بیٹھیں میں معلوم کرتا ہوں۔" ہیڈ ماسٹر صاحب نے کہا۔ اس کے بعد وہ آفس سے باہر نکل گئے۔ تقریباً دس منٹ بعد وہ ایک طالب علم کو اپنے ساتھ لے آئے اور کہا کہ یہ لڑکا تنویر کا پڑوسی ہے۔ یہ آپ دونوں کو اس کا گھر دکھا دے گا۔ لڑکا ان کو ایک جھونپڑی کے دروازے پر لے گیا اور ان کو باہر کھڑا کر کے خود اندر چلا گیا۔ واپسی میں دو بہت ہی میلے کچیلے بچے ساتھ لے آیا۔ ان بچوں نے بتایا کہ "ابو بھیک مانگنے گئے ہوئے ہیں رات کو واپس آئیں گے۔" یہ بات سن کر وکٹر کو حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا۔

رات کو وکٹر اور اویس کچی آبادی پہنچے تو ایک معذور کو گھسٹتے ہوئے گھر میں داخل ہوتے دیکھا۔ اس کی دونوں ٹانگیں کٹی ہوئی تھیں۔ وہ ہاتھوں کی مدد سے خود کو گھسیٹ رہا تھا۔ اویس نے قریب جا کر اسے سلام کیا اور کہا "بابا ہم تنویر کے سلسلے میں آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتے

ہیں۔"

"کہاں ہے میرا تنویر.....! کہاں ہے میرا لال ..... کہاں ہے..... کہاں ہے؟" وہ معذور چیخ چیخ کر پوچھ رہا تھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بارش کی طرح برس رہے تھے۔

"بابا صبر کریں..... تنویر خیریت سے ہے ہم ابھی آپ کو بتاتے ہیں۔ ذرا کہیں بیٹھ تو جائیں۔" اویس نے معذور بھکاری کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دیتے ہوئے کہا۔

بوڑھا ان کو اپنی جھونپڑی میں لے گیا۔ وہاں سوائے ایک چٹائی، چند گدڑیوں اور جست کے برتنوں کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔ بھکاری نے ان کو چٹائی پر بیٹھنے کو کہا۔ بیٹھنے کے بعد اویس نے کہا۔ "بابا.....! تنویر کا ہسپتال میں علاج ہو رہا ہے .... انشاء اللہ اس کا پاگل پن ختم ہو جائے گا..... آپ ہم کو یہ بتائیں کہ وہ پاگل کیسے ہوا.....؟"

بھکاری نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہنا شروع کیا۔ "تنویر کی والدہ تین بچوں کو اللہ کے اور میرے سہارے چھوڑ کر چل بسی۔ اسے ایک رات اچانک ہیضہ ہو گیا اور صبح تک وہ انتقال کر گئی۔ اب بچوں کی دیکھ بھال اور روزی کمانے کی دہری ذمہ داری مجھ پر آن پڑی تھی۔ ہمارا کوئی رشتہ دار نہیں تھا کیونکہ میں نے اور تنویر کی ماں نے یتیم خانے میں پرورش پائی تھی۔ میرا پیشہ راج گیری تھا۔ اتنی کمائی ہو جاتی تھی کہ ہمارا گزارا ہو جاتا تھا۔ تنویر کو بچپن ہی سے پڑھ لکھ کر سائنس دان بننے کا شوق تھا۔ میں بھی چاہتا تھا کہ بچے پڑھ لکھ کر کوئی مقام بنالیں۔ اس لئے جیسے تیسے کر کے تینوں بچوں کے اخراجات پورے کرتا رہا۔ صبح کو ناشتہ کرا کے ان کو اسکول بھیج کر خود کام پر چلا جاتا تھا۔ دوپہر اور رات کا کھانا تنویر بناتا تھا۔ اس طرح وقت گزرتا جا رہا تھا کہ اچانک ایک حادثے نے میری ٹانگیں ضائع کر دیں۔ میں چار منزلہ عمارت کی آخری منزل پر سامنے کا پلستر کر رہا تھا کہ پرات ٹوٹ گیا۔ میری جان تو بچ گئی مگر دونوں ٹانگیں چُورا ہو گئیں اور ڈاکٹروں نے انہیں کاٹ دیا۔ جب ہسپتال سے گھر پہنچا تب میں نے تنویر سے کہا کہ "بیٹا! اب قسمت نے مجھے مجبور کر دیا ہے کہ تمہاری تعلیم اور کھانے پینے کے اخراجات پورے کرنے کے لئے بھیک مانگنا شروع کر دوں۔" تنویر نے فوراً میرے منہ پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ "ابو جان نیچے والا ہاتھ اوپر والے ہاتھ سے بڑا ہوتا ہے۔ میں آپ کو بھیک مانگنے نہیں دوں گا.....! رہی اخراجات کی بات تو حکومت ہماری ضرور مدد کرے گی۔ میں سائنس

دان بن کر ملک کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ ایک ایجاد بھی تقریباً" مکمل کرلی ہے اس لئے حکومت ضرور ہماری مدد کرے گی۔" وہ بہت پرامید تھا اور دوسرے دن سے دفتروں کے چکر لگانا شروع کردیے تھے مگر ایک ماہ کی آوارہ گردی کے بعد ایک دن ناکامی کا اعتراف کرتے ہوئے وہ بہت رویا۔ اور کہا کہ وہ پڑھائی چھوڑ کر مزدوری کرے گا مگر بھیک مانگنے نہیں دے گا۔"

"دوسرے دن سے اس نے مزدوری تلاش کرنا شروع کردی۔ کیونکہ اب گھر کا خرچ گھر کا سامان بیچ کر پورا ہونے لگا تھا۔ ایک ہفتے بعد اسے قالین کی ایک فیکٹری میں نوکری مل گئی۔ مگر اللہ تباہ کرے ایک افسر کو اس نے مل میں جاکر تنویر اور دوسرے لڑکوں کو نوکری سے نکلوادیا۔ یہ بھی نہ سوچا کہ ہم غریب پھر عزت کی روٹی کہاں سے کھائیں گے۔ یہ بھی نہ سوچا کہ سرکار اگر مجبوروں کو روٹی نہیں دے سکتی تو ان کے بچوں کو مزدوری سے تو نہ روکے۔ اس دن تنویر گھر پہنچ کر بہت رویا۔ پھر دوسرے دن سے اس نے پھر فیکٹریوں میں مزدوری تلاش کرنا شروع کردی۔ اسے ہر جگہ سے یہ جواب ملنے لگا کہ سرکار نے بچوں کی مزدوری پر سختی سے پابندی لگا رکھی ہے۔ وہ روزانہ تھکا ہوا مایوس گھر لوٹتا تھا۔ اس طرح ایک مہینہ گزر گیا۔ گھر کا سامان بھی پورا بک چکا تھا اور گھر میں پکانے کے لئے بھی کچھ نہیں بچا تھا۔

اس رات چھوٹے بچے بھوک سے بلک بلک کر رونے لگے۔ ان کو روتا دیکھ کر میں اور تنویر بھی رونے لگے تھے۔ اب میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ صبح سے بھیک مانگنا شروع کروں گا۔ میں نے وہ فیصلہ جب تنویر کو سنایا تو اس کا دماغ الٹ گیا۔ وہ بلک بلک کر رونے لگا اور ساتھ ہی اول فول بھی بکنے لگا۔ وہ رات ہم نے جاگ کر گزاری اور صبح کو میں گھسٹتا ہوا۔ بھیک مانگنے چل پڑا۔ شام کو واپس گھر آیا تو تنویر گھر پر نہیں تھا۔ میں معذور بھیک مانگتے ہوئے اسے تلاش بھی کرنے لگا مگر وہ آج تک نہیں ملا۔"

وہ تفصیل سن کر اویس کی آنکھیں بھی بھیگ گئیں۔ وہ خود کو مجرم تصور کررہا تھا۔ کیونکہ اس نے ہی تنویر کو نوکری سے نکلوایا تھا کافی دیر تک وہ سرجھکائے بیٹھا رہا تب وکٹر نے اسے مخاطب کرکے کہا۔

"دوست! مجھے بھی تو ترجمہ کرکے بتاؤ کہ اس معذور نے کیا تفصیل بتائی ہے؟" وکٹر کے مخاطب کرنے پر اویس نے وکٹر کو پوری تفصیل ترجمہ کرکے سنائی۔ جسے سن کر وکٹر کی آنکھیں

بھی پُرنم ہو گئیں۔ مگر وہ سخت حیران بھی تھا۔ اس نے کہا۔ "کیا یہاں کی حکومت معذوروں کی مالی مدد نہیں کرتی!!! اور کیا تنویر جیسے باصلاحیت لوگوں کی سرپرستی نہیں کی جاتی......!!!؟ یہ کیسا ملک ہے......!!؟"

تھکے تھکے قدموں سے وہ دونوں جھونپڑی سے باہر نکل آئے۔ تنویر سے اس کے باپ کو ملانے کے لئے انہوں نے اگلے دن کا وعدہ کر لیا تھا۔ "میں اس معذور آدمی اور اس کے بیٹے کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور کروں گا۔" وکٹر جیسے اپنے آپ سے کہہ رہا تھا۔ "میں اپنے سفارت خانے اور تمہاری حکومت دونوں سے بات کروں گا۔ شاید وہ لڑکا ٹھیک ہو سکتا ہے۔ میں دونوں حکومتوں سے کہوں گا کہ بچوں کی مزدوری کے خلاف لب کھولتے ہوئے آنکھوں کو تو بند نہ کریں۔ ایک نظر تو جھانک لیں، ان کی آنکھوں میں، ان کے دلوں میں اور ان کی بوسیدہ جھونپڑیوں میں۔" ●●

ننھے منے بچے پھولوں سے ہیں اچھے

وطن عزیز پاکستان ایک جمہوری اسلامی ملک ہے اور اسلام میں بچوں کو بنیادی اہمیت دی گئی ہے۔ رسول اکرم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بچوں کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے فرمایا کہ "وہ شخص ہم میں سے نہیں جو بچوں پر رحم نہ کرے"، سرکار دو عالمؐ بچوں سے اتنا پیار کرتے تھے کہ آپؐ جب کبھی بچوں کے قریب سے گزرتے تو کمال شفقت سے ان کو سلام کرنے میں پہل کرتے۔ آپؐ نے بچوں سے نرمی اور شفقت کا حکم دیا۔ آپؐ کی زندگی بے شمار مثالوں سے بھری ہوئی ہے کہ آپؐ عام بچوں سے بھی بے حد پیار، محبت اور شفقت فرماتے تھے۔ آپؐ کے ارشادات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اسلام میں بچوں کے حقوق و فرائض کو دیگر مذاہب کے مقابلے میں زیادہ فوقیت دی گئی ہے۔ اسلام ایک ایسا آفاقی مذہب ہے جس میں بچوں کے کردار کو ہر شعبۂ زندگی میں تسلیم کیا گیا ہے۔ بچوں کی معصوم زندگیوں کا تحفظ اور ان کی جائز خواہشات کا احترام بھی اسلامی تعلیمات کا ایک اہم حصہ ہے۔

ملک کے تین لاکھ بچے قالین بافی کی صنعت سے وابستہ ہیں۔ قالین بافی کی صنعت سے تقریباً" پندرہ لاکھ افراد کا روزگار وابستہ ہے۔اِتنی کثیر تعداد میں افراد کسی بھی صنعت سے وابستہ نہیں ہیں۔ پاکستان سے قالین دنیا کے تقریباً" 45 ممالک کو برآمد کئے جاتے ہیں جن میں اکثریت یورپی ممالک کی ہے۔اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بچوں کی مؤثر قوت قالین سازی سے وابستہ ہے اور جن خاندانوں میں قالین بافی کو ایک پیشہ کی حیثیت حاصل ہے وہاں بچوں کو بہت ہی چھوٹی عمر سے ہی تربیت فراہم کی جاتی ہے تاکہ وہ بلوغت تک ایک ہنر مند بن جائیں۔ دیگر اور صنعتوں کی طرح کارپٹ انڈسٹری کے بارے میں کہ اس وقت پاکستان میں کتنی چھوٹی بڑی فیکٹریاں ہیں، کوئی مستند اعداد و شمار نہیں ہیں۔ لیکن یہ اندازہ ہے کہ اس وقت پورے ملک میں 10 سے 11 لاکھ تک بچے اس انڈسٹری میں کام کررہے ہیں، چھوٹی فیکٹریوں میں عموماً" 15 سے 20 تک بچے جن کی عمریں آٹھ نو سال سے پندرہ سال تک ہوتی ہیں اور اوقات کار 12 گھنٹے یا اس سے بھی زیادہ ہوتے ہیں۔

حکومت نے لیبر کورٹ قائم کئے ہوئے ہیں اور بچوں سے محنت کرانا قانوناً" جرم ہے لیبر قوانین میں اس بات پر سختی سے زور دیا گیا ہے کہ

کم عمر بچوں سے کسی بھی نوعیت کا محنت طلب کام نہ لیا جائے۔ لیکن ان قوانین پر کس حد تک عمل در آمد ہوتا ہے۔ اس سے ہم سب خوب واقف ہیں۔ قالین سازی کی صنعت سے وابستہ نہ صرف بچوں بلکہ دوسرے کارکنوں کے لئے حفاظتی اقدامات سمیت طبی سہولتوں کا فقدان ہے۔ اگر یوں کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ قالین سازی میں کام کرنے والے بچوں کے مسائل میں کم اجرت، لمبے اوقات کار اور غیر صحت مندانہ ماحول کے علاوہ سب سے اہم مسئلہ قالین سازی کے دوران اون کے دھاگوں سے اڑنے والا رُواں ہے جو مسلسل قالین کی بُنائی کے دوران ذرات کی شکل میں سانس کے ذریعے انسانی جسم میں تنفس کے عمل کو متاثر کرتے ہیں، جس سے مختلف نوعیت کی بیماریاں پیدا ہوجاتی ہیں اور یہ رُواں مسلسل ان کے پھیپھڑوں کو بھی متاثر کرتا رہتا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ ٹی بی یا دمے کے مریض بن جاتے ہیں۔ یہ ذرات بینائی کو بھی متاثر کرتے ہیں لہٰذا حفاظتی اقدامات سمیت طبی سہولتوں کی فراہمی کو یقینی بنانا بے حد ضروری ہے خصوصاً" بچوں سے متعلق قوانین پر سختی سے عمل ہونا ضروری ہے۔

دل و دماغ کی اضافی قوت
کے لئے مُربّہ سیب چاندی کے
ورق میں لپیٹ کر کھائیے

احمد کا

مُربّہ سیب

انتہائی مقوی

امی جان زندہ باد

محمد نصیر ہزاروی

بیگم رئیس جوں ہی گھر میں داخل ہوئیں۔ مارے حیرت کے ان کی آنکھیں پھیلتی گئیں اور پھر ان کے چہرے پر یکدم حیرت کی بجائے غصے کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ انہوں نے دیکھا کہ ان کا آٹھ سالہ بچہ عمیر دیوار کے سہارے سر کے بل کھڑا ہوا ہے۔

"عمیر!" انہوں نے تیز لہجے میں پکارا۔ "یہ کیا احمقانہ حرکت ہے؟؟"

عمیر اپنی امی کی آواز سن کر فوراً سیدھا ہوگیا۔ لیکن جواب دینے کی بجائے سر جھکا کر کھڑا ہوگیا۔ اسے خاموش دیکھ کر بیگم رئیس احمد مزید آگ بگولہ ہوگئیں اور اس مرتبہ انہوں نے اپنی ملازمہ کو آواز دی۔ "آیا!"

ایک ادھیڑ عمر ملازمہ ان کی آواز سن کر ایک کمرے سے تیزی سے نکلی اور بیگم صاحبہ کو غصے میں دیکھ کر سہم گئی اور بولی۔

"جی! بی بی جی۔"

"کیا کر رہی تھیں؟" "بیگم صاحبہ! شہلا کو بہلا رہی تھی۔" شہلا بیگم رئیس کی بچی کا نام تھا جس کی عمر تقریباً" چار سال تھی۔

"اور عمیر کا خیال کون رکھے گا؟"

"ابھی تھوڑی دیر پہلے تو عمیر میاں بھی میرے پاس تھے۔"

"میں دیکھ رہی ہوں کہ دن بدن تم لاپرواہ ہوتی جا رہی ہو۔ یہی حالت رہی تو پھر تمہاری چھٹی کروانی پڑے گی۔" بیگم رئیس نے ملازمہ سے کہا اور پھر پیر پٹختی ہوئی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔ عمیر میاں چند لمحے سکتے کی سی حالت میں کھڑے رہے اور پھر وہ بھی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

اگلی صبح عمیر میاں اور شہلا جیسے ہی اسکول جانے کے لئے تیار ہو کر کمرے سے نکلے بیگم رئیس کی تیز آواز نے ان کے قدم روک لئے۔

"عمیر!!"

عمیر فوراً" اپنی امی کی طرف گھوما اور سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔

"یہ تم نے موزے کون سے پہن رکھے ہیں؟" انہوں نے غصے سے پوچھا۔

عمیر نے اپنے پاؤں کی طرف دیکھا ایک میں سفید اور دوسرے میں نیلا موزہ۔ وہ خاموشی سے اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔

"پتہ نہیں اسے کیا ہو گیا ہے؟ کچھ دنوں سے اپ سیٹ دکھائی دے رہا ہے۔" بیگم رئیس بڑبڑاتی ہوئی اس کے پیچھے چل دیں۔

رئیس صاحب اپنی چھوٹی سی لائبریری میں بیٹھے کسی کتاب کے مطالعے میں مصروف تھے کہ اچانک بیگم رئیس لائبریری میں داخل ہوئیں اور ان سے مخاطب ہو کر بولیں۔ "سنیئے!"

رئیس صاحب کتاب سے نظریں ہٹا کر سوالیہ نظروں سے بیگم کی جانب دیکھنے لگے۔ بیگم انہیں اپنی جانب متوجہ پا کر بولیں "عمیر کے اسکول سے ان کی کلاس ٹیچر کا فون آیا تھا۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ عمیر کچھ دنوں سے اپ سیٹ دکھائی دے رہا ہے۔ کلاس میں بھی گم صم رہتا ہے اور پڑھائی میں بھی دلچسپی نہیں لے رہا ہے۔ میں خود بھی یہ محسوس کر رہی ہوں کہ کچھ دنوں سے وہ عجیب و غریب بلکہ الٹی سیدھی حرکتیں کر رہا ہے۔"

"پھر کیا کرنا چاہئے؟"

"میرا خیال ہے اسے کسی ماہر نفسیات کو دکھانا چاہئے۔"

"ٹھیک ہے کل آپ اسے ڈاکٹر جمیل کے پاس لے جائیں۔"

"لیکن کل تو مجھے ایک پارٹی میں جانا ہے۔" بیگم رئیس نے منہ بنا کر کہا۔

"تو پھر پرسوں چلی جائیں۔"

"افوہ! آپ کو پتہ بھی ہے کہ میں "حقوقِ اطفال و خواتین" کی تنظیم کی صدر ہوں۔ میرے پاس اتنا وقت کہاں؟ کبھی کوئی تقریب کبھی انٹرویو، کبھی استقبالیہ، کبھی میٹنگ، کبھی مارچ اور کبھی شو۔ اگر کبھی خوش قسمتی سے وقت مل جائے تو تنظیم کے دیگر امور بھی تو دیکھنے پڑتے ہیں۔"

"تو پھر کیا کیا جاسکتا ہے؟" رئیس صاحب نے لاپرواہی سے کندھے اچکائے۔ "مجھے تو دفتر کے کاموں سے ہی فرصت نہیں۔"

"تو پھر عمیر کو کون لے کر جائے گا؟"

"یہ آپ جانیں۔"

"آپ کا بھی تو کچھ لگتا ہے؟"

"انہی کے لئے دن رات محنت کرتا ہوں۔"

"تو انہی کے لئے کچھ وقت فارغ کرلیں۔"

"آپ بھی ان کی ماں ہیں۔ ساری دنیا کے بچوں کے حقوق کی آواز تو آپ زور و شور سے لگا رہی ہیں لیکن اپنے بچوں کے حقوق ادا کرنے کے لئے آپ کے پاس وقت ہی نہیں۔" رئیس صاحب نے جل کر کہا۔

"افوہ! آپ کو تو خدا واسطے کا بیر ہے، میری سرگرمیوں سے، پتہ نہیں کیا دشمنی ہے؟" یہ کہہ کر بیگم رئیس پیر پٹختی ہوئی نکل گئیں۔

رات کا نجانے کون سا پہر تھا کہ اچانک کسی کے جھنجھوڑنے پر بیگم رئیس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ ہڑبڑا کر بیٹھ گئیں۔ انہوں نے دیکھا کہ رئیس صاحب ان کے سامنے کھڑے ہوئے ہیں اور ہونٹوں پر انگلی رکھ کر انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کررہے ہیں۔

"کیا بات ہے؟؟" بیگم رئیس نے بھی دبی دبی آواز میں لیکن پریشانی سے پوچھا۔ رئیس صاحب نے جواب دینے کی بجائے ہاتھ سے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور دبے قدموں دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ آہستگی سے دروازہ کھولا اور کمرے سے باہر نکل گئے۔ ان کا رخ بچوں کے کمرے کی طرف تھا۔ بیگم رئیس بھی ان کے پیچھے چل رہی تھیں۔ کمرے کے سامنے پہنچ کر رئیس صاحب نے بیگم کو تالے کے سوراخ سے اندر کمرے میں جھانکنے کا اشارہ کیا۔ بیگم رئیس نے خاموشی سے جھک کر آنکھ تالے کے سوراخ سے لگادی۔ اندر کا منظر دیکھ کر وہ اچھل پڑیں۔ پریشانی اور تفکر کی پرچھائیاں ان

کے چہرے پر لہرانے لگیں۔ کیوں کہ انہوں نے دیکھا کہ کمرے میں دیوار کے سہارے عمیر میاں سر کے بل کھڑے ہوئے ہیں۔ رئیس صاحب نے ایک مرتبہ پھر انہیں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

"عمیر کو اس وقت چھیڑنا مناسب نہیں ہے۔ کیوں کہ وہ نیند کی کیفیت میں ہے۔" کمرے میں پہنچ کر رئیس صاحب نے کہا۔

"اسے ڈاکٹر کو دکھانا ہی پڑے گا۔" بیگم رئیس بہت زیادہ فکر مند دکھائی دے رہی تھیں۔ "لیکن بیگم! میں تو کل دفتر میں بہت زیادہ مصروف ہوں اور آپ کا کوئی نہ کوئی پروگرام ہوگا۔" رئیس صاحب کے لہجے میں طنز تھا۔

"بھاڑ میں جائے آپ کا دفتر اور میرے پروگرام۔" بیگم نے چڑ کر کہا۔ "میں اپنے بچے کو خود لے کر جاؤں گی۔" رئیس صاحب کے لبوں پر فاتحانہ مسکراہٹ پھیلتی چلی گئی۔ بیگم رئیس پیر پٹختی ہوئی کمرے سے نکل گئیں۔

☆ --- ☆ --- ☆

اگلے دن شام کو رئیس صاحب جوں ہی آفس سے گھر آئے تو بیگم کو اپنا منتظر پایا۔ انہیں دیکھتے ہی بیگم بول اٹھیں "میں عمیر کو ڈاکٹر کے پاس لے کر گئی تھی۔"

"تو پھر کیا بتایا ڈاکٹر جمیل نے؟" رئیس صاحب نے پوچھا۔

"ڈاکٹر جمیل نے کہا کہ بچہ احساس محرومی کا شکار ہے اور مناسب توجہ نہ ملنے کی وجہ سے ذہنی طور پر الجھاؤ کا شکار ہے اور انہوں نے کہا ہے کہ اسے تنہا بالکل نہ رہنے دیا جائے۔" بیگم نے جواب دیا اس سے پہلے کہ رئیس صاحب کچھ کہتے ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ رئیس صاحب نے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھایا اور دوسری طرف سے کی جانے والی بات سن کر ریسیور بیگم کی طرف بڑھادیا اور بولے۔ "تمہاری دوست کا فون ہے۔" اور خود عمیر میاں کے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ عمیر اور شہلا دونوں اپنے کمرے میں کھیل رہے تھے۔ رئیس صاحب ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد بیگم رئیس کمرے میں داخل ہوئیں۔

"کس کا فون تھا؟" رئیس صاحب نے پوچھا۔

مسز منظور تھیں ہماری آرگنائزیشن کی جنرل سکریٹری ہیں۔ کہہ رہی تھیں کہ کل صبح کو بڑی اہم تقریب ہے اور ملک کی اہم شخصیات اس میں مدعو ہیں۔ لہٰذا میری موجودگی بے حد

ضروری ہے۔" بیگم نے کہا۔

"تو پھر!!"

"میں نے صاف منع کردیا کہ عمیر کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے لہٰذا میں نہیں آسکتی۔"

"لیکن بیگم! اتنی اہم تقریب میں آپ موجود نہ ہوں یہ کیسے ہوسکتا ہے؟"

"بھاڑ میں جائے تقریب وقریب۔ میں اپنے عمیر کو چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔" بیگم نے عمیر میاں کو گود میں بھرلیا اور محبت سے سر سہلانے لگیں۔ شہلا بھی اپنی امی کے ساتھ لگ کر کھڑی ہوگئی۔ بیگم نے اس کی پیشانی پر بھی پیار سے بوسہ دیا۔ رئیس صاحب کے لبوں پر زندگی سے بھرپور مسکراہٹ دوڑتی چلی گئی۔ عین! اسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ ملازمہ نے ریسیور اٹھایا اور پھر ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر آواز دی۔

"بیگم صاحبہ آپ کا فون ہے۔"

بیگم رئیس نے آہستگی سے عمیر کو گود سے اتارا اور فون کی طرف بڑھ گئیں۔ ان کے کمرے سے جاتے ہی عمیر میاں کھلکھلا کر ہنس پڑے اور پھر ابو سے مخاطب ہوئے۔

"کہیے ابو! کیسی رہی میری اداکاری؟"

"لیکن بیٹا! آئیڈیا کس کا تھا؟"

"آپ کے اس آئیڈیے میں جان تو میری اداکاری نے بھری ہے۔ دیکھیں امی جان کو ایک لمحے کے لئے شک نہیں ہوا کہ میں بیمار نہیں ہوں بلکہ بیمار ہونے کی اداکاری کررہا ہوں۔"

"ویسے ہماری ترکیب رہی بڑی کامیاب۔" رئیس صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "لیکن میرا خیال ہے اب یہ ڈرامہ ختم کردینا چاہیے۔ کیوں کہ امی جان بے حد پریشان ہیں اور....."

عمیر کا جملہ نامکمل ہی رہا کیوں کہ اسی وقت دروازہ کھلا اور بیگم رئیس غصے میں بھری کمرے میں داخل ہوئیں اور آتے ہی عمیر سے بولیں۔

"یہ کس ڈرامہ کی بات ہورہی تھی؟"

"وہ بیگم کل رات کو جو ڈرامہ ٹی وی پر آیا تھا اس کے متعلق بات ہورہی تھی کہ اب وہ ڈرامہ بہت ہی طویل ہوچکا ہے اور اب ختم کردیا جانا چاہیے۔" رئیس صاحب نے موقع کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے فوراً بات بنائی۔ بیگم رئیس کچھ دیر خاموشی سے رئیس صاحب اور عمیر کو کھڑی گھورتی رہیں پھر مسکراتے ہوئے بولیں۔"لائن کٹ جانے کی وجہ سے مجھے فوراً واپس آنا پڑا۔ میرا بھی یہی خیال ہے کہ ڈرامہ بہت طویل ہوچکا ہے۔ اسے اب ختم کردینا چاہیے۔"

بیگم رئیس کا جملہ سُن کر مسکرادیے اور عمیر

میاں ۔ امی جان زندہ باد کا نعرہ لگاتے ہوئے اپنی امی سے لپٹ گئے اور پھر بھلا شہلا کیوں پیچھے رہتی۔ رئیس صاحب البتہ مطمئن انداز میں مسکراتے ہوئے سر ہلا رہے تھے۔

"آپ سے تو میں سمجھ لوں گی۔" بیگم رئیس نے مصنوعی غصّے سے کہا تو وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔

حضور ﷺ کی بچّوں سے محبّت

ایک دفعہ ایک دیہاتی اقرع بن حابس حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وقت آپؐ اپنے نواسوں کو پیار کر رہے تھے۔ یہ دیکھ کر وہ بولا۔ "میرے دس بچے ہیں مگر میں نے کبھی اپنے بچوں کو اس طرح پیار نہیں کیا۔"

یہ سن کر آپؐ نے فرمایا : "اگر تمہارے دل سے رحم نکل گیا ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں۔"

زمانہ جاہلیت میں عربوں میں دستور تھا کہ لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی زمین میں زندہ دفن کر دیتے تھے۔ وہ لڑکیوں کی پیدائش کو باعثِ ندامت اور باعثِ شرم سمجھتے تھے۔

حضورؐ اللہ کا دین لے کر آئے تو لڑکیوں کو اس سفاکانہ رسم سے نجات ملی۔ اِسلام قبول کرنے کے بعد ایک صحابیؓ زمانۂ جاہلیت کا قصّہ سُنا رہے تھے : "میری ایک بچّی تھی بہت پیاری سی۔ جب وہ کچھ بڑی ہوئی تو اسے زندہ دفن کرنے کا مرحلہ درپیش ہوا۔ بچّی مجھ سے بہت محبّت کرتی تھی اور مجھے بھی اس سے بہت محبّت تھی۔ میں اسے بہانے سے اس جگہ لے کر چلا جہاں ایک اندھا کنواں تھا۔ بچّی اپنی پیاری زبان میں باتیں کرتی جا رہی تھی اور میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔ جب میں نے اسے کنویں میں گرا دیا تو وہ چلّانے لگی۔

"ابّا..... ابّا..... ابّا....."!!" وہ خوفزدہ آواز میں چلّاتی جاتی یہاں تک کہ بچّی کی آواز آنا بند ہو گئی۔"

جیسے ہی ان صحابیؓ نے زمانۂ جاہلیت کے اس قصّے کو ختم کیا تو دیکھا کہ حضورؐ کا چہرۂ مُبارک دُکھ اور تکلیف سے بھر گیا ہے، آنکھوں سے آنسو جاری..... ہیں اور داڑھی مبارک آنسوؤں سے بھیگ چکی ہے!!

یہ تجدیدِ عہد کا دن ہے

حفیظ الرحمٰن احسن

تیئس مارچ کا دن کہہ رہا ہے یہ ہم سے — سنو گے میری کہانی ہر ایک موسم سے
کہا تھا تم نے کہ "اک سلطنت نئی مل جائے — ہماری قومی امنگوں کو زندگی مل جائے
خدائے پاک نے تم پر کرم کیا ایسا — کہ سات سال میں یہ خواب ہوگیا پورا
گزر گئے ہیں اب اس بات کو پچاس برس
یہ واقعہ ہے مگر، ہیں یہ سب اداس برس
تمہارے قومی عزائم نہ ہوسکے پورے — ابھی تلک ہیں ادھورے جو خواب دیکھے تھے
چلن ہوا نہ وطن میں کبھی دیانت کا — عجیب حال رہا ہے یہاں سیاست کا
ہوا نہ علم کا چرچا، عجیب حالت ہے — وطن پہ چھائی ہوئی آج بھی جہالت ہے
بنے گا امن کا گہوارہ کس طرح یہ وطن — کرے گا کون یہاں عام نیکیوں کا چلن
پچاس سال جو گزرے ہیں ان پہ غور کرو
مناؤ سال گرہ بھی، مگر ذرا سوچو
بنے گا کیسے وطن، تمہارا وطن — بنے گا کیسے بہاروں کا دیس پیارا وطن
تیئس مارچ کے دن، دل سے باندھ لو پیمان — کہ جاں لڑا کے سنوارو گے اپنا پاکستان
چمن تمہارا ہے، اس کو نکھارنا ہے تمہیں — جو قرض تم پہ ہے اب تک، اتارنا ہے تمہیں!
نئے سرے سے یہ تمہید عہد کا دن ہے
سنو سنو کہ یہ تجدید عہد کا دن ہے

خریدار بنایئے انعام پایئے

آنکھ مچولی مُلک کا مقبول ترین رسالہ ہے۔

اس کے قارئین کی رائے میں یہ ایک بے حد مفید اور معیاری رسالہ بھی ہے۔ ادارہ آنکھ مچولی نے اس رسالے کو گھر گھر پہنچانے کے لیے ایک نئی اسکیم شروع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ آنکھ مچولی کے جو ساتھی آنکھ مچولی کے دس سالانہ خریدار بنائیں گے، اُنھیں ادارے کی جانب سے ایک ڈیجیٹل گھڑی تحفے میں پیش کی جائے گی ___ دس خریدار بنانا کوئی مشکل کام نہیں۔ اپنے دوستوں اور رشتہ داروں، محلے اور اسکول میں ایسے دس ساتھی آپ ذرا سی کوشش سے تلاش کر سکتے ہیں۔

آگے بڑھیے

خریدار بنایئے انعام پایئے

نام: ______________ ولدیت: ______________

کلاس: ______________ تعلیمی ادارہ: ______________

پتہ: ____________________________________

فون نمبر: ______________ دستخط: ______________

لمحہ بہ لمحہ

آر ایس راہی

میری آپ بیتی اب تو ایک بھولی بسری داستان ہے۔ میری عمر اسی سال ہونے کے باوجود مجھ میں اب بھی زورِ بازو موجود ہے۔ نئی نسل کا نوجوان بھی میرا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ نہ جانے کیوں مجھے پاکستان کے بچوں سے محبت ہے۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ یہ وہی بات ہو گئی، جب انسان بوڑھا ہو جاتا ہے تو وہ پھر سے بچہ بن جاتا ہے لیکن بات یہ قطعاً نہیں ہے کیونکہ اس پیارے وطن کی سرزمین کو بڑوں نے ہی نقصان پہنچایا ہے اور میں بڑوں کی طرف سے مایوس ہوتا چلا جا رہا ہوں۔ اس کے برعکس میں نے پاکستان کے مستقبل یعنی بچوں سے امیدیں وابستہ کی ہیں۔ میں نے ہزاروں بچے دیکھے ہیں اور ہر قسم کے۔ ایسے بچے بھی میں نے دیکھے ہیں جنہیں دیکھ کر میری آنکھوں سے آنسو ساون کی طرح برسنے لگے اور ایسے بھی جنہیں دیکھ کر میرا دل خوشی و

مسرت سے جھوم اٹھا۔

ایک سوال جو مجھ سے بچوں نے اور کبھی کبھی بڑوں نے بھی پوچھا کہ کیا پاکستان کا قیام ضروری تھا۔ جواب آپ بھی سن لیں۔

قیام پاکستان کا وجود میں آنا اتنا ہی ضروری تھا جتنا انسان کے زندہ رہنے کے لئے سانس کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اس کو آپ ایک مثال سے سمجھیں۔ ہندوؤں کا مسلمانوں سے ازلی نفرت کا مجھے علم تھا لیکن میرا چھوٹا بھائی احسن اس بات سے لاعلم تھا ایک دن اسکول میں پانی کی ٹنکی سے اس نے پانی پیا۔ گلاس بھرا ہوا تھا اور اس نے آدھا پانی پی کر باقی گلاس ہی میں رکھ چھوڑا۔ ایک ہندو لڑکا جو احسن کے ساتھ ڈیسک پر بیٹھا تھا کھیلتے کھیلتے ٹنکی کی طرف آیا اور شدت پیاس کی وجہ سے اس نے گلاس کا پانی بلا سوچے سمجھے پی لیا۔ ابھی وہ پانی پی کر پلٹا ہی تھا کہ ایک اور ہندو لڑکا چیختے ہوئے اس کے قریب آیا۔

"وشنو.... تم نے ٹنکی سے پانی پیا ہے؟"

"کیوں کیا ہوا کرشن؟" وشنو نے حیرت سے پوچھا۔

"تم بتاؤ تو سہی گلاس میں پڑا پانی تو نہیں پیا؟" کرشن انتہائی گھمبیر لہجے میں بولا۔

"ہاں۔" وشنو نے اثبات میں حیرت سے سرہلایا۔

"گلاس میں پڑا پانی ہی پیا ہے۔"

کرشن اچانک چیخ پڑا۔ "وشنو یہ تم نے کیا کیا یہ ... یہ تو.... مسلمان احسن کا جھوٹا تھا۔"

"نہیں یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔" اب کے بار وشنو پریشانی سے چیخ پڑا۔ "اب ..... اب کیا ہوگا مم .... میں نے تو مسلمانوں کا جھوٹا پیا اور ..... میں پلید ہوگیا۔" وشنو ایک لمحے کے لئے شش و پنج میں مبتلا ہوگیا۔ پریشانی کی لاتعداد لکیریں اس کے ماتھے پر بن گئی تھیں اور پھر اچانک وہ کوئی فیصلہ کرکے گھر چلا گیا۔ یہ خبر پل بھر میں تمام اسکول میں پھیل چکی تھی اور ہر ایک سوچ رہا تھا کہ اب کیا ہوگا کل کا سورج چڑھا اور لڑکے اسکول آئے تو حیرت سے سب کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ وشنو نے خودکشی کرلی تھی۔ اس نے اپنی دانست میں اپنے ناپاک وجود کو دنیا سے پاک کردیا تھا۔ یہ خبر جب احسن نے سنی تو اس پر حیرت کا سکتہ سا پڑ گیا۔ لمحوں میں یہ خبر گھر اور گھر سے محلے میں پھیل گئی۔ احسن کے ساتھ ساتھ ہم سب کے سر ندامت سے جھکے ہوئے تھے' احسن تو باقاعدہ رونے لگا تھا اس نے کئی دن تک سوگ منایا کیونکہ وشنو کے موت کا ذمہ دار وہ خود کو سمجھ رہا تھا۔ پھر بڑی مشکل سے ہم نے اسے سمجھایا کہ یہ موت تمہارے سر نہیں ہے یہ تو

اس کی اپنی بے وقوفی اور غیر مذہبی ہونے کا نتیجہ ہے تب کہیں جاکر اس کے دل کو تسلی ہوئی۔

☆ --- ☆ --- ☆

اب میں اپنی زندگی کے ایک اور سخت ترین دور سے گزر رہا تھا۔ یہ ایسا راستہ تھا جس پر جابجا کانٹے ہی کانٹے تھے جو بار بار پاؤں میں چبھ جاتے تھے کانٹوں کا یہ طویل درد تھا جو کہ آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا۔ قائد پاکستان نے واشگاف الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ پاکستان کا حصول اب بغیر قربانی کے ممکن نہیں۔ تحریک پاکستان کا وہ نازک دور آپہنچا تھا۔ جس میں مسلمانوں کا خون سڑکوں پر پانی کی طرح بہایا گیا۔ لیکن ظلم کی یہ داستان اس لئے رقم ہوتی چلی گئی کہ مسلمانوں کے سامنے ایک منزل تھی اور وہ منزل پاکستان تھی جو کہ آزاد خطہ تھا جس کا حصول مسلمانوں سے قربانی کا تقاضہ کر رہا تھا۔

میں ایک جلوس میں شریک تھا اور جلوس کے سب شرکاء انتہائی جوش و جذبے کے ساتھ بھرپور احتجاج کر رہے تھے میرے دل میں بھی ایک طوفان سا موجزن تھا۔ ہندوؤں کے خلاف خون رگوں میں کھول رہا تھا۔ یہ جلوس اختتام کے قریب ہی تھا کہ اچانک چاروں طرف سے ہندوؤں نے حملہ کردیا۔ ان کے ہاتھوں میں نیزے اور بھالے تھے۔ پل بھر میں ہندوؤں نے کئی مسلمانوں کو شہید کردیا۔ مسلمانوں نے جیسے ہی یہ صورتحال دیکھی، نہتے ہی ہندوؤں پر حملہ آور ہوگئے کچھ لمحوں بعد وہاں ہڑبونگ سی مچ گئی تھی۔

میرے دل میں تو پہلے ہی غصے اور نفرت کا طوفان پل رہا تھا، موقعہ دیکھ کر ایک ہندو پر حملہ آور ہوگیا اور مقابلہ کرتے ہوئے اس کے ہاتھ سے نیزہ چھین لیا۔ پھر جیسے ہی موقع ملا میں نے نیزہ اس کے سینے میں اتار دیا۔ آج بھی اس ہندو کی مکروہ چیخ میرے کانوں میں گونجنے لگتی ہے جیسے یہ کوئی پرانا واقعہ نہ ہو۔ یہ میرے ہاتھوں پہلا قتل تھا۔ جو میں نے اپنی جان بچانے اور وطن کے حصول کے لئے کیا تھا۔

میں نے ابھی نیزہ ہندو کے سینے سے نکالا ہی تھا کہ اچانک ایک اور ہندو نے پیچھے سے آکر مجھ پر بھالے سے حملہ کردیا۔ میں اگرچہ بے خبر تھا لیکن اللہ کی دی ہوئی زندگی کی مہلت ابھی ختم نہیں ہوئی تھی اس لئے میں پلٹا تو بھالا کندھے سے رگڑتا ہوا زمین سے جا ٹکرایا۔

اتنے وقت میں، میں ہوشیار ہوگیا تھا چنانچہ نیزہ سنبھال کر اس کے پیٹ میں گھسیڑ دیا۔ ایک اور مکروہ چیخ میرے کانوں سے ٹکرائی اور وہ پیٹ پکڑتا ہوا

زمین پر گر پڑا اس کے پیٹ سے خون کا فوارہ سا ابل پڑا تھا میں نے نیزہ اس کے پیٹ سے کھینچ کر نکالا تو پیٹ کی انتڑیاں اس کے ساتھ ہی باہر نکل آئیں۔ کچھ لمحوں کے لئے وہ تڑپتا رہا اور پھر اس کا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔

اس جھڑپ میں جتنے مسلمان شہید ہوئے تھے اس سے زیادہ ہندو ہلاک ہوگئے تھے پھر جب ہندوؤں نے اپنا حشر دیکھ لیا تو میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔

☆ --- ☆ --- ☆

ایک آزاد خطہ پاکستان کی صورت میں وجود میں آچکا تھا اور بہت سے قافلے خوابوں کی سرزمین پر پہنچ چکے تھے اور بہت سے پہنچنے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ ہمارا گھرانا بھی چلنے کے لئے تیار تھا اور رات کا انتظار کر رہا تھا۔ دن کے وقت کوئی قافلہ جانے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا کیوں کہ ہندو کسی کو بھی زندہ نہیں چھوڑ رہے تھے۔ ان کے سروں پر جنون سوار تھا جہاں بھی مسلمان دیکھتے اسے تہہ تیغ کر دیتے تھے ایسے عالم میں ہم بھی اپنا آبائی وطن چھوڑ رہے تھے اور ہجرت کرنے پر مجبور تھے۔ لیکن رات کے وقت قافلے محفوظ ہو کر نکل رہے تھے۔ بڑی سراسیمگی کی حالت میں جب ہم اپنے گھر سے نکلے تو ہمارے پاس صرف زیورات تھے باقی سارا سامان گھر کے ساتھ ہی رہ گیا تھا۔

چلتے چلتے قافلے کی عورتیں تھک گئیں ان میں اور چلنے کی سکت نہیں تھی۔ بوڑھے رہبر کو کہا گیا کہ وہ کسی مناسب جگہ پر ڈیرہ ڈال دے تاکہ عورتیں آرام کر سکیں اور بچوں کے لئے پانی کا بھی انتظام کر لیا جائے۔ بچے تو سب ہی بھوک اور پیاس سے بلک رہے تھے لیکن ان میں سے ایک بچے کی حالت بہت ہی خستہ ہوگئی تھی۔ اس بچے کے ساتھ صرف اس کی ماں تھی اس کا باپ ہندوؤں کے ہاتھوں شہید ہوچکا تھا۔ وہ روتے روتے نڈھال ہوگیا۔ اس کے گلے سے آواز بھی مشکل سے نکل رہی تھی۔ ماں کی حالت بچے کو دیکھ دیکھ کر غیر ہو رہی تھی وہ بار بار بوڑھے رہبر کے پاس جاتی اور ان سے کہتی۔

"بابا! میرا بچہ پیاس سے نڈھال ہوچکا ہے آپ کہیں سے پانی کا انتظام کر دیں۔"

بوڑھا رہبر کہتا۔ "بیٹی صبر کرو .... اللہ پر بھروسہ رکھو ..... یہاں تو دور دور تک کہیں بھی پانی کے آثار نہیں ہیں۔"

یہ سن کر وہ بے قرار ہوجاتی اور بچے کی پیشانی چومنے لگتی اور سینے سے بھینچنے لگتی۔

ہولناک صحرا میں درختوں کے ایک جھنڈ

کے نیچے پہنچ کر بوڑھے رہبر نے قافلہ روک دیا اور ڈیرہ ڈال دیا۔ گرچہ آنکھوں میں نیند نہیں تھی لیکن سب تھکے ہوئے تھے اس لئے کچھ ہی دیر میں سو گئے نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ میں زمین پر لیٹ کر کھلے آسمان کے تاروں کی طرف دیکھنے لگا۔ میرے کانوں میں اسی بچے کے رونے کی آوازیں کافی دیر تک آتی رہیں۔ جسے سن کر میرا دل بے چین سا ہو جاتا تھا لیکن مجبور تھا کیونکہ اس مقام پر پانی ملنا مشکل نہیں ناممکن تھا۔ اس وقت جب صبح کا ستارہ نکلنے جارہا تھا۔ بچے کی آواز آنی بند ہوگئی۔ غالباً اس پر غشی طاری ہوگئی تھی۔

صبح ہوتے ہی قافلہ دوبارہ چل پڑا۔ بچہ ماں کی گود میں اب بھی سو رہا تھا۔ ماں کے دل کو کچھ سکون مل گیا تھا۔ ابھی کچھ دور ہی گئے تھے کہ اچانک بچہ پھر رونے لگا اس کی ماں بے قرار ہو کر پھر بوڑھے رہبر کے پاس چلی گئی۔

"بابا! میرا بچہ کل سے پیاسا ہے کہیں سے بھی انتظام کیجئے۔"

ماں کے لہجے میں ایک درد سا تھا جسے بوڑھے رہبر نے بھی محسوس کیا وہ بھرائے ہوئے لہجے میں بولے۔

"بیٹی اللہ پر بھروسہ رکھو..... مجھے یقین ہے کہ کچھ دیر بعد ہم ایک نہر تک پہنچ جائیں گے۔"

وہ پھر پلٹ آئی اور قافلہ بدستور چلتا رہا۔ کافی دور تک چلنے کے بعد بوڑھے رہبر نے خوشی سے چیخ کر کہا۔

"پانی کا انتظام ہوگیا..... وہ دیکھو یہاں سے نہر کچھ کچھ نظر آرہی ہے۔"

قافلے والوں کے چہروں پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ بچے کی ماں کی بے قراری اب اور بڑھ گئی وہ جلد سے جلد نہر تک پہنچنا چاہ رہی تھی جب نہر مکمل نظر آگئی اور تقریباً پچاس قدموں کا فاصلہ رہ گیا تو اچانک بچہ خاموش ہوگیا اور ایک ٹک ماں کو دیکھنے لگا۔ ماں نے چونک کر بچے کو دیکھا پھر مسکرا کر بولی۔ "بس بیٹے! اب تجھے اور تکلیف نہیں ہوگی پانی کا انتظام ہوگیا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ بے اختیار نہر کی طرف دوڑ پڑی۔ وہ نہر کے کنارے بیٹھ گئی اور بچے کو پانی پلانے لگی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے بچہ پانی پینے سے انکار کررہا ہو اور ماں کوشش کررہی ہو کہ اسے پانی پلا سکے پھر اچانک وہ چیخ پڑی۔

"بابا..... بابا..... یہ..... یہ میرے بچے کو کیا ہوگیا ہے..... دیکھو یہ پانی نہیں پی رہا۔"

بوڑھا رہبر دوڑ کر اس کے پاس پہنچ گیا اور بچے کو ہلا جلا کر دیکھا پھر اس کے دل کی دھڑکن

دیکھی۔ بوڑھے رہبر نے ایک لمحے کے لئے سر جھکادیا اور پھر بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"بیٹی! اللہ نے اپنی امانت واپس لے لی ہے..... صبر کر..... تمہارا بیٹا اپنے رب سے جاملا ہے۔"

"نہیں؟" وہ ہذیانی انداز میں چیخ پڑی۔ "بیٹا .....!" کہہ کر اس نے بیٹے کی لاش کو سینے سے چمٹالیا اور رونے لگی۔ یہ دیکھ کر صرف میرے ہی نہیں سب قافلے والوں کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ایک معصوم بچے نے بھوک اور پیاس سے جان دے دی تھی صرف اپنے پاکستان کی خاطر جس کی لاش کو بھی پاکستان کی مٹی میسر نہیں ہوئی۔ بچے کی لاش کو وہیں پر دفنا دیا گیا۔

پورا دن ہم یونہی چلتے رہے پھر شام ہونے لگی۔ سورج غروب ہوچکا تھا اور ہم ایک ایسی جگہ سے گزر رہے تھے جہاں ایک طرف درختوں کے گھنے گھنے جھنڈ تھے اور دوسری طرف کبھی صحرا اور کبھی درختوں کا سلسلہ شروع ہوجاتا تھا۔ ہم بے خوف و خطر بوڑھے کی رہبری میں سرزمین پاک کی طرف لحہ بہ لحہ نزدیک تر ہورہے تھے چلتے چلتے ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں دونوں اطراف پر درختوں کے جھنڈ تھے۔ ہلکا ہلکا اندھیرا پھیلنے لگا تھا قافلہ پھونک پھونک کر قدم اٹھا رہا تھا کہ اچانک درختوں کے جھنڈ سے شور کی آواز اٹھی اور درجنوں آدمی درختوں سے نکل کر قافلے پر حملہ آور ہوگئے۔ قافلہ تو پہلے ہی بے سروسامانی کا شکار تھا حملہ آوروں کا مقابلہ کہاں سے کرتا نتیجتاً قافلہ تتربتر ہوگیا جس کے سینگ جہاں سمائے اس طرف جانکلا۔ یہ حملہ آور ہندو تھے جنہوں نے کئی مسلمانوں کو شہید کردیا اور باقی جان بچاکر ادھر ادھر بھاگ گئے۔

جب پاکستان بن گیا تھا۔ مسلمان رہن سہن کے درپیش مسائل سے نبرد آزما ہورہے تھے۔ کیمپوں میں لوگ مقیم تھے' دانے پانی کا انتظام مشکل سے ہورہا تھا۔ میں پاگلوں کی طرح ایک کیمپ سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے کیمپ کا چکر لگا رہا تھا اور اپنے ماں باپ کو ڈھونڈ رہا تھا لیکن ہر طرف سے مجھے مایوسی کا چہرہ دیکھنا پڑ رہا تھا۔ ماں باپ کے بغیر میں تنہائی کا شکار ہوگیا تھا۔ اکثر تنہائی میں میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگ جاتے اور دیر تک اپنے والدین کی جدائی میں روتا رہتا۔ وقت گزرتا گیا میں نے مزدوری شروع کردی۔ دھیرے دھیرے پاکستان میں لوگ آسودہ حال ہوتے گئے۔ کاروبار شروع ہوگئے اور لوگ اچھی زندگی بسر کرنے لگے۔

ایک دن میری ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوئی جسے میں پہچانتا تھا وہ ہندوستان میں

ہمارے محلے دار تھے۔ اسے دیکھ کر دل بے اختیار مچلنے لگا۔ ہندوستان میں اپنے گھر کی یاد ستانے لگی۔ میں نے اسے باتوں ہی باتوں میں اپنے ماں باپ کے متعلق بتایا تو وہ چونک اٹھا۔

"میں تو سمجھ رہا تھا تمہیں ان کے بارے میں خبر ہوگی!" اس نے کہا۔

"کک .... کہاں ہیں میرے ماں باپ؟" خوشی و مسرت سے میرا انگ انگ بھر گیا۔ اس نے سر جھکا کر جواب دیا۔

"وہ ہندوؤں کے ہاتھوں، ہندوستان ہی میں شہید ہوگئے تھے لیکن پاکستان کی سرزمین تک زیادہ فاصلہ نہیں تھا اس لئے ہم نے انہیں یہاں لاکر دفنا دیا۔"

میں نے اپنے والدین کی شہادت کی خبر سنی تو آنکھیں نم ہونے لگیں پھر اس نے مجھے ان کی قبریں دکھائیں ۔ قبریں دیکھ کر مجھے کچھ سکون محسوس ہوا۔ اس خیال سے کہ اب انہیں ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں تھی وہ اگر نہ ملے ان کی قبریں تو مل گئی تھیں!

وقت چیونٹی کی چال سرک رہا تھا اور میرے دل پر لگنے والے زخم جو اب بھرنے لگے تھے یکایک پھر سے ایسے تازہ ہوئے کہ وہ زخم میرے لئے ناسور بن گیا۔ پاکستان کا مشرقی بازو جنرل یحییٰ خان کے دور میں ہم سے جدا ہوگیا۔ مشرقی پاکستان اب بنگلہ دیش بن گیا تھا۔ جس پاکستان کو بے شمار قربانیوں کے عوض مسلمانوں نے حاصل کیا تھا اب وہ اسی کے حکمرانوں کی غلط ترکیبوں اور بے راہ روی کے نتیجے میں دو ٹکڑے ہوگیا تھا یہ سانحہ ہرگز معمولی نہیں تھا مجھ کو سکتہ ہوگیا تھا ایسا غم تو مجھے اپنے والدین سے جدائی کے دن بھی محسوس نہیں ہوا تھا، بے اختیار مسلمانوں کی بدنصیبی پر آنسو بہانے لگا اور گڑگڑا کر اللہ تعالیٰ سے پوچھنے لگا۔ "یا خدا یہ کیا ہوگیا ہے .... یا خدا یہ کیا ہوگیا ہے؟"

☆ --- ☆ ---- ☆

ملک کے دولخت ہونے کا زخم ہمیشہ ہی دل پر تازہ رہا۔ اسی کے ساتھ ساتھ جو میری نظر نئی نسل پر پڑنے لگی تو میں خوف سے کانپنے لگا۔ قوم پاکستان نے "مقصد پاکستان" کو پس پشت ڈال دیا تھا۔ بلکہ پیروں تلے روند ڈالا تھا۔ نئی نسل پاکستان کے دشمنوں کی سازشوں کا بڑی آسانی سے شکار ہونے لگی تھی۔ پاکستان مسلمانوں نے اسلام کے نام پر حاصل کیا تھا لیکن میری نگاہیں تو کچھ اور دیکھ رہی تھیں۔ شراب اور جوا جس کی اسلام نے ممانعت کی ہے بر سرِعام ہو رہے تھے۔ چوری ڈاکے دیدہ دلیری سے ہونے لگے۔ سب سے بڑھ

زندگی پانچ الفاظ کا مجموعہ ہے ہر لفظ اپنے اندر نیا رنگ اور جذبہ لئے ہے۔
ذرا دیکھئے زندگی کن الفاظ کی رنگینیوں کا نام ہے۔
ز : زندہ دلی سے رہو۔
ن : نصیحتوں پر عمل کرو۔
د : دشمن کو معاف کرو۔
گ : گمراہی کی طرف نہ جاؤ۔
ی : یاد رکھو اپنے ماضی کو۔

کر جو غم مجھے دیمک کی طرح چاٹنے لگا وہ یہ تھا کہ پاکستانیوں کے آپس میں لسانی، گروہی اور قومی تعصبات ابھرنے لگے میرا کلیجہ کٹ کر رہ گیا۔

"یا خدا یہ کیا ہو رہا ہے؟" میں رب کے سامنے پھر گڑگڑانے لگا۔

گزرتے گزرتے میں حال کی تصویر کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ پاکستان کے نقشے میں جگہ جگہ دراڑیں پڑ چکی تھیں۔ نقشے پر دھندلاہٹ چھا گئی تھی۔ نقشہ زخمی ہو گیا تھا اس سے جگہ جگہ خون رس رہا تھا۔ یکایک میں چونک اٹھا نقشے میں کہیں کہیں روشنی کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ نقشے پر پھیلا ہوا طوفان ان کرنوں کو مٹا رہا تھا۔ لیکن وہ صبر و عزیمت کی علامت بن کر پھوٹ رہی تھیں پھر میری آنکھوں میں چمک دوڑنے لگی گزشتہ برس چودہ اگست پر مجھے ایک بچے کی تقریر یاد آنے لگی اس کے بول سے زیادہ اس کے عزم میں پختگی تھی وہ کہہ رہا تھا۔ "دشمنو! غلط فہمی میں نہ رہنا پاکستان اسلام کے نام پر بنا ہے .... اور! اسلام کے نام ہی پر زندہ و پائندہ رہے گا۔ کیا ہوا کہ پاکستان کو کچھ لوگ دیمک کی طرح چاٹ رہے ہیں یہ .... یہ تو ہمارے ہی اعمال کا نتیجہ ہے۔

سوچو بھائیو! یہ ہمارے ہی اعمال کا نتیجہ ہے۔ لیکن میں دشمنوں سے کہتا ہوں، اس خوش فہمی میں نہ رہنا کہ تم لوگ پاکستان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے صفحہ ہستی سے مٹا دو گے کیا ہوا کہ بڑوں نے غلطیاں کیں اور وہ تمہارے زیرِ اثر آ گئے۔ پاکستان کا مستقبل تو محفوظ ہے۔ ہاں ..... ہم ہی پاکستان کا مستقبل ہیں۔ انشاء اللہ ہمارے ہی ہاتھوں تم لوگوں کو ذلت آمیز شکست سے دوچار ہونا پڑے گا کیونکہ ہماری ہمت چٹانوں کو بھی ریزہ ریزہ کرنے والی ہے اور ہمارا حامی و ناصر رب کائنات ہے .... رب کائنات!"

حال کی تصویر سے کرنیں تیزی سے پھوٹنے لگی تھیں اور باطل کا طوفان اس کو مٹانے کے درپے تھا۔ لیکن ازل سے باطل کا مقدر شکست ہے۔ باطل کا چہرہ کملایا ہوا نظر آ رہا تھا اور روشنی کی یہ معمولی معمولی کرنیں لمحہ بہ لمحہ پوری تصویر پر چھا رہی تھیں۔ ●●

کشفِ احساس

محمد اکبر رشید

سہ پہر کے تین بجے کا وقت تھا۔ ایک شخص تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ڈی ایس پی کے دفتر میں داخل ہوا۔ وہ چہرے سے کافی پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ "کون ہو تم، کدھر جارہے ہو؟" ڈیوٹی پر موجود کانسٹیبل نے اسے روکتے ہوئے پوچھا اور وہ رُک گیا۔ "میں ڈی ایس پی صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔" وہ بولا۔

"مگر وہ اس وقت کسی سے نہیں مل سکتے، آپ جاسکتے ہیں۔" وہ ترشی سے بولا۔

"دیکھو، یہ میرا کارڈ ان تک پہنچا دو اور انہیں کہو کہ عارف جمال آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔" اس نوجوان نے یہ کہہ کر اپنا تعارفی کارڈ سپاہی کی طرف بڑھادیا۔ وہ سپاہی عارف جمال کو گھور کر رہ گیا اور کارڈ لے کر ڈی ایس پی کے کمرے میں داخل ہوگیا۔ کچھ دیر بعد سپاہی کمرے سے باہر نکلا۔ اس مرتبہ اس کے چہرے

پر نرمی کے آثار تھے۔ "آیئے' صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔" سپاہی نے کہا اور عارف جمال کو اندر جانے کا اشارہ کیا۔

"آیئے عارف جمال صاحب' تشریف رکھیئے" ڈی ایس پی نے انہیں دیکھ کر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

کچھ پتہ چلا جناب میرے بچے عثمان کا۔" عارف جمال نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"ابھی تک تو نہیں لیکن مجھے امید ہے کہ جلد ہی ہم اس کا سراغ لگالیں گے۔" ڈی ایس پی صاحب نے کہا۔

"ڈی ایس پی صاحب' آج تین روز ہوگئے ہیں عثمان کو گم ہوئے ضرور اسے کسی بردہ فروش گروہ نے اغوا کرلیا ہوگا' ہم نے شہر کا چپہ چپہ چھان مارا ہے' اخباروں میں اشتہار چھپ چکے ہیں' اعلانات کروا رہے ہیں مگر اس کا کچھ پتہ نہیں چل سکا' نہ جانے کون ظالم اسے لے گیا' آپ یقین کریں اس کی ماں کا تو رو رو کر برا حال ہے۔" عارف جمال دکھ بھرے لہجے میں بولا۔

"عارف صاحب' ہم آپ کے احساسات کو بخوبی سمجھتے ہیں' ہم اپنی طرف سے کسی کوتاہی کا ثبوت نہیں دے رہے' تمام تھانوں کو اطلاع دے دی گئی ہے' تصویریں بھی پہنچا دی گئی ہیں آپ حوصلہ رکھیں جلد ہی ہماری پولیس عثمان کا سراغ لگالے گی۔" ڈی ایس پی صاحب نے اسے دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔

"ڈی ایس پی صاحب کیا واقعی میرا عثمان مل جائے گا؟"

"ہاں' ہاں بھئی آپ فکر نہ کریں اللہ نے چاہا تو وہ جلد ہی مل جائے گا۔"

"مجھے تو عثمان کے گم ہونے کی پریشانی کے علاوہ ایک دوسری پریشانی بھی لاحق ہوگئی ہے۔" عارف جمال نے رومال سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے کہا۔

"دوسری پریشانی' میں سمجھا نہیں؟" ڈی ایس پی صاحب نے حیران ہو کر پوچھا۔

"جناب میرے والد صاحب اپنے پوتے سے بے پناہ محبت کرتے ہیں' انہیں عثمان کے گم ہونے کی خبر ملی تو اس غم میں بستر سے جالگے ہیں' وہ عثمان کی گم شدگی کا قصور وار مجھے سمجھتے ہیں اگر عثمان نہ مل سکا تو وہ....." عارف جمال سے جملہ مکمل نہ ہوسکا۔ ان کی آواز رندھ گئی اور ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔

"عارف صاحب' حوصلہ رکھیں عثمان مل جائے گا' مگر آپ کے والد صاحب' آپ کو کیوں قصور وار سمجھتے ہیں؟" انہوں نے پوچھا۔

"جناب' آپ کو شاید علم نہ ہو۔" عارف جمال

نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"میرے والد صاحب آج سے کئی برس پہلے امریکہ میں رہتے تھے۔ تقریباً" پندرہ سال انہوں نے وہاں گزارے ہیں۔ ان کی شادی بھی وہیں امریکہ میں ہوئی' میں بھی وہیں پیدا ہوا۔ میرے دادا جان یوں تو میرے والد صاحب کو پاکستان آنے کے لئے کہتے رہتے تھے۔ مگر میری پیدائش کے بعد تو انہوں نے میرے والد صاحب کو پاکستان آنے پر مجبور کردیا اور اتنا اصرار کیا کہ ہم سب کچھ سمیٹ کر پاکستان آگئے۔ اس وقت میں دس سال کا تھا۔ مجھے پاکستان بہت پسند آیا۔ میرے عزیز و اقارب اور یہاں کے لوگ مجھے بہت اچھے لگے۔ شاید اس لئے کہ میری رگوں میں پاکستانی خون دوڑ رہا تھا اور میرے خون میں وطن کی مٹی کی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ جلد ہی مجھے احساس ہوگیا کہ اپنے وطن کے مقابلے میں امریکہ کی حیثیت کچھ بھی نہیں ہے۔ ابھی ہمیں امریکہ سے آئے ہوئے دو برس گزرے تھے کہ کراچی میں فسادات کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ آئے روز قتل و غارت گری ہونے لگی۔ شہر کا سکون برباد ہوکر رہ گیا تھا۔ کسی کی جان و مال محفوظ نہیں تھے۔ یہ حالات دیکھ کر ابو کو پاکستان سے سخت مایوسی ہوئی اور انہوں نے اس کا برملا اظہار بھی کردیا۔ وہ دبے دبے لفظوں میں پاکستان چھوڑنے کے ارادے کا اظہار کرنے لگے تھے۔ ایک دن وہ سہ پہر کو گھر آرہے تھے کہ چند نامعلوم افراد نے انہیں روک لیا اور آگے بڑھنے سے روک دیا۔ کیونکہ اس دن شاید پہیہ جام ہڑتال کا اعلان ہوچکا تھا۔ ابو نے انہیں سمجھانا چاہا مگر وہ مشتعل ہوگئے۔

انہوں نے ابو کی کار پر پیٹرول چھڑک کر آگ لگادی۔ آن کی آن میں کار دھڑا دھڑ جلنے لگی۔ ابو کے ایسے اوسان خطا ہوئے کہ بے ہوش ہوگئے' انہیں کچھ ہوش نہ رہا۔ آنکھ کھلی تو خود کو ہسپتال میں موجود پایا۔ "خوب' مگر کیا ان تخریب کاروں میں سے کسی نے انہیں بچالیا؟" ڈی ایس پی صاحب نے سوال کیا۔

"جی نہیں جناب' وہ تو کار کو آگ لگا کر بھاگ گئے۔ یہ تو چند نیک دل لڑکوں نے ان کی کار کو جلتے دیکھا تو وہ ان کی مدد کے لئے دوڑے اور انہیں کار سے نکال کر ہسپتال پہنچادیا۔ بعد میں انہوں نے ابو کی جیب سے برآمد ہونے والی پاکٹ ڈائری سے پتہ لے کر ہمیں اطلاع کردی۔ ہم یہ سن کر بدحواس ہوگئے اور فوراً" ہسپتال پہنچے۔ خوش قسمتی سے ابو کو زیادہ زخم نہیں آئے تھے اور آگ کے نقصان پہنچانے سے پہلے ہی

انہیں کار سے نکال لیا گیا تھا۔ ہم نے ان نوجوانوں کا شکریہ ادا کیا کہ خدا نے انہیں ابو کو حادثہ سے بچانے کا وسیلہ بنادیا تھا۔"

"واقعی' وہ نوجوان تو فرشتے ثابت ہوئے تھے۔" ڈی ایس پی صاحب نے کہا۔ "مگر اس کہانی سے آپ کی دوسری پریشانی کا کیا تعلق؟"

"وہی تو بتارہا ہوں جناب' ابو کی خیریت پر ہم نے سکھ کا سانس لیا۔ مگر ہم نے محسوس کیا کہ وہ دل برداشتہ ہوچکے تھے۔ جب ہم گھر پہنچے تو اس بات کی تصدیق ہوگئی۔ ابو نے کہا کہ "میں نے پاکستان چھوڑنے اور دوبارہ امریکہ جانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔" اور ہم چونک اٹھے ہمارا خدشہ درست ثابت ہوا تھا۔

"مگر کیوں ابو جان؟" ہم نے سوال کیا۔ حالانکہ ہم جانتے تھے کہ وہ یہ فیصلہ کیوں کررہے ہیں۔

"اس لئے کہ پاکستان رہنے کے لئے مناسب ملک نہیں ہے' یہاں پر تو آدمی کی جان و مال محفوظ نہیں ہے' تم نے دیکھ لیا کہ میرے ساتھ کیا سلوک کیا گیا ہے' کیا اس کے بعد بھی یہاں رہنے کی گنجائش رہ جاتی ہے؟ میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ پاکستان چھوڑ کر دوبارہ امریکہ چلے جائیں گے۔" سب سے زیادہ پریشان میں تھا۔ مجھے پاکستان سے بہت محبت ہوچکی تھی اور میں اس سرزمین کو چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ میں ان کی منت سماجت کرنے لگا میں نے کہا : "ابو جان' کسی بھی جگہ تمام لوگ تو اچھے نہیں ہوتے' آپ کو نقصان پہنچانے والے پاکستانی تھے تو یہ بھی تو دیکھیں کہ آپ کی جان بچانے والے بھی تو پاکستانی تھے۔ وہ بھی تو اسی ملک کے باشندے تھے۔ چند برے لوگوں کی وجہ سے ہم سب کو برا تو نہیں سمجھ سکتے اور نہ ہی اس کے لئے پاکستان کو الزام دے سکتے ہیں اور پھر جو تکلیف مقدر میں ہوتی ہے وہ آکر رہتی ہے۔ ویسے بھی ابو' اب مجھے امریکہ اچھا نہیں لگتا' وہاں دوسرے درجے کے شہری بننے سے میں پاکستان کا شہری بننے کو ترجیح دوں گا۔ یہ سرزمین ہماری اپنی تو ہے۔ یہاں ہمیں جو عزت' تحفظ ہے وہ امریکہ میں نہیں مل سکے گا اور پھر پاکستان تو ہماری پہچان ہے مجھے اپنی پہچان کھونا اور اسے چھوڑنا بالکل گوارا نہیں۔"

ابو نے میری ضد کے آگے ہتھیار تو ڈال دیئے مگر اتنا ضرور کہا کہ "بیٹا! میری بات یاد رکھنا پاکستانی بننا تمہیں مہنگا پڑے گا۔" آج اس بات کو پورے بیس سال گزر چکے ہیں۔ اب میرا بیٹا اور ان کا پوتا عثمان گم ہوگیا ہے تو انہوں نے اپنی وہ بات یاد دلائی ہے کہ "میں نہ کہتا تھا پاکستانی بننے

پر تمہیں پچھتانا پڑے گا۔" وہ اسے میری نادانی سمجھتے ہیں۔ اب ان کا اعتماد پاکستان' پاکستان کی حکومت اور انتظامیہ پر سے ختم ہوتا جارہا ہے۔ اگر عثمان نہ ملا تو ان کا اعتماد پاکستان پر سے مکمل طور پر اٹھ جائے گا پھر وہ کسی قیمت پر یہاں نہ رہیں گے اور میں .... اپنے بیٹے اور والد دونوں کی جدائی شاید نہ سہہ سکوں" عارف جمال نے اپنی بات ختم کی تو ان کی آنکھوں سے آنسو ایک مرتبہ پھر رواں تھے۔

"عارف صاحب! دل چھوٹا مت کریں' انشاء اللہ پاکستان' پاکستان کے لوگوں اور اس کی انتظامیہ پر سے آپ کے والد صاحب کا اعتماد ختم نہیں ہوگا' آپ جیسے سچے اور وطن پرست لوگوں کو دھرتی کبھی مایوس نہیں کرتی' یہ میرا ایمان ہے۔" ڈیس ایس پی صاحب پرجوش انداز میں بولے ان کا جملہ مکمل ہوتے ہی ایک سپاہی دوڑتا ہوا ان کے کمرے میں داخل ہوا اور کہنے لگا۔

"سر..... تھانیدار صاحب کہہ رہے ہیں کہ کسی عارف صاحب نے تین روز پہلے جس بچے کی گم شدگی کی رپورٹ درج کرائی تھی وہ مل گیا ہے۔"

"کیا کہا؟ عارف صاحب کا بچہ مل گیا' مگر کس طرح؟" ڈی ایس پی صاحب خوشی سے

○ آہستہ آہستہ چلنا اور منزل مقصود تک جا پہنچنا دوڑنے اور راستے ہی میں رہ جانے سے بہتر ہے۔

اچھل پڑے۔ ان کی آنکھوں میں چمک دوڑ گئی۔ عارف جمال کا بھی خوشی کے مارے برا حال تھا۔

"سر..... ہماری چھاپہ مار ٹیم نے کچھ دیر پہلے چھاپہ مار کر شہر کے جنوبی اور ویران علاقے سے بردہ فروشوں کے ایک گروہ کو گرفتار کیا ہے ان کے قبضے سے اور بھی بہت سے بچے برآمد ہوئے ہیں۔" سپاہی نے تفصیل بتائی تو ڈی ایس پی صاحب کھل اٹھے۔ وہ عارف جمال کا پاکستان پر اعتماد بحال کرنے کی خوشی سے سرشار دکھائی دے رہے تھے۔

"مبارک ہو عارف صاحب' آپ کا بچہ مل گیا' آیئے آپ کو عثمان سے ملادیں۔" ڈی ایس پی صاحب نے کہا تو عارف جمال اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے بے خود ہو کر "پاکستان زندہ باد" کا نعرہ لگایا پھر آگے بڑھ کر میز پر رکھا ہوا پاکستانی جھنڈا اٹھایا اور بے ساختہ چوم لیا۔ ان کے دل میں اپنی دھرتی کے لئے پیار ہی پیار تھا اور آنکھوں میں اپنے وطن پاکستان کے لئے ایک عجیب سے تفاخر کا احساس نمایاں ہوگیا تھا۔

اے نونہالو

ضیاء الحسن ضیاء

خوشیوں کے گیت گاؤ ہر رنج کو بھلاؤ
اوروں کو بھی ہنساؤ تم خود بھی مسکراؤ
دل میں نہ خوف لاؤ آگے قدم بڑھاؤ
تم ہو جواں وطن کے ملت کے کام آؤ
دل کو خوشی ملے گی ہر راستہ سجاؤ
بانٹو وطن میں خوشیاں تاکہ سکون پاؤ
آپس میں سب ہیں بھائی بُغض و حَسد مٹاؤ
ہے وقت کا تقاضا سب کو گلے لگاؤ
مسلم کا ہے یہ شیوہ نفرت کو بھول جاؤ
بجھنے نہ پائیں ہرگز ایسے دیئے جلاؤ
یہ سرزمیں تمہاری سب اس پہ جاں لٹاؤ
تم علم کی ضیاء سے
دنیا کو جگمگاؤ

پرانا کمبل

فرزانہ روحی

یوں تو ہر روز گھر کی صفائی ہوتی ہے۔ لیکن سال میں ایک مرتبہ چچی جان اچھی طرح پورے گھر کی صفائی کرتی ہیں۔ جس کے بعد گھر کا کونا کونا چمک اٹھتا ہے۔ اس سالانہ اجتماعی صفائی میں گھر کے ملازموں کے ساتھ ساتھ بچے بھی شامل ہوجاتے ہیں۔ دورانِ صفائی نکلنے والے پرانے کپڑے، برتن اور دیگر اشیاء چچی جان نوکروں اور غریبوں میں تقسیم کردیا کرتی ہیں۔

اس جمع تقسیم میں بعض اوقات وہ کچھ ایسی چیزیں بھی دوسروں کو دے دیتیں جو ان کے خیال میں بیکار یا ردی ہوتی، لیکن دوسروں کی نظر میں وہ بہت اہم ہوتی۔ جیسے بلال کی پرانی کھٹارہ سائیکل جس کے چاروں پہیے بیکار تھے اور سیٹ غائب تھی۔ لیکن وہ اسے بہت سنبھال کر رکھتا تھا اور کبھی کبھی نکال کر کھیلتا بھی تھا۔

اس سالانہ صفائی کے دوران چچی جان اور

چچا جان میں ہلکی پھلکی جھڑپ بھی ہو جایا کرتی تھی۔ اس کی وجہ بھی وہی تھی کہ چچا جان پرانی چیزیں جمع کر کے رکھ دیتے جنہیں چچی جان پھینک دینا چاہتی تھیں۔ چچا جان منع کرتے' ان کا کہنا تھا کہ انہیں ان پرانی اشیاء سے لگاؤ ہے۔

دراصل ہمارے دادا جان کے چاروں بیٹے یعنی ہمارے ابو اور تین چچاؤں کی فیملی ایک ساتھ رہتی ہے۔ مل جل کر سب کی زندگی بہت اچھی طرح گزر رہی ہے۔ پچھلے سال دادا جان کا انتقال ہو گیا تھا۔ دادی جان بہت ضعیف ہو چکی تھیں۔ ان کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں رہتی تھی۔ وہ زیادہ تر آرام کرتی رہتی تھیں۔ ہم پوتے پوتیاں اور بہوئیں ان کا خیال رکھتی تھیں۔ دادی جان کو لوگ بہت خوش نصیب سمجھتے تھے کہ ان کے چاروں بیٹے بہت فرماں بردار ہیں اور بہوئیں بھی بہت اچھی نکلیں۔ کسی بہو نے بھی کوئی تکلیف نہیں پہنچائی۔ اس طرح دادی جان کا گھر دوسروں کے گھروں کی طرح رشتے' ناتے چھوٹے بڑے اور ساس بہو کے روایتی جھگڑوں سے بچا رہا۔ یوں کبھی گھر کی فضا خراب نہیں ہوئی۔ تاہم یہ سالانہ صفائی ایسی تھی کہ جس میں کچھ بدمزگی پیدا ہو جاتی تھی۔ جس کی وجہ عموماً سب کی اپنی پرانی چیزوں سے انسیت تھی۔

چچی جان کا کہنا تھا کہ گھر میں افراد سے زیادہ سامان جمع ہو گیا ہے۔ جس میں زیادہ تر بے کار اور پرانی اشیاء ہیں۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ گھر کے زیادہ تر افراد اپنی چیزوں کو سنبھال کر رکھنے والے تھے۔ میری چھوٹی بہن جو اب نویں جماعت میں پہنچ چکی ہے' اس کے بچپن کے کپڑے ابھی تک بکس میں رکھے ہوئے ہیں۔ جنہیں وہ کبھی کبھی نکال کر دیکھتی اور خوش ہوتی ہے مگر وہ اسے کسی کو دینے پر تیار نہیں۔ یہاں تک کہ دادی جان کے زمانے کا ایک غرارہ ان کے بھی بکس میں موجود ہے۔ اس بکس کو تو ہم بہن بھائی یعنی دادی جان کے پوتے پوتیاں ان کی "جائیداد" کہتے ہیں۔

سالانہ صفائی کے دوران جب دادی جان کا یہ بکس کھلتا تھا۔ تو ہم سب بہن بھائی اس بکس میں ذوق و شوق سے جھانکتے۔ ایک بہت چمکیلا غرارہ سوٹ' ایک پرانے زمانے کا پاندان کچھ زیورات اور کپڑے تھے۔ جنہیں ہم لوگ دادی جان کے "انٹیکس" کہتے ہیں۔ جس پر دادی جان خوب ہنستیں۔ ایک پیکٹ میں کمبل یا شال ٹائپ کی کوئی چیز لپٹی رہتی۔ جس کے بارے میں چچا جان کا کہنا تھا کہ وہ ایک شال ہے جسے دادا جان نے دادی جان کو تحفہ میں دیا تھا اور اس پر

سونے کے تاروں کا کام ہے۔ ابو کا کہنا تھا کہ اس پر چاندی کے تاروں کا کام ہے۔

جبکہ دادا جان جب زندہ تھے تو کہتے تھے اس میں ہیرے جڑے ہوئے ہیں۔

دادی جان اس کمبل نما چیز کو بہت عزیز رکھتی تھیں۔ کسی کو ہاتھ لگانے کی اجازت بھی نہیں تھی۔ تقریباً" ہر سال صفائی کے دوران چچی جان اس پیکٹ کو کھول کر دھوپ لگانا چاہتیں تو دادی جان کہتیں۔" اسے یونہی دھوپ میں رکھ دو کھولنے کی اجازت نہیں ہے۔" چونکہ اس سال دادی جان بیمار تھیں۔ لہٰذا ہم سب بہن بھائی اس چکر میں تھے کہ اس پیکٹ کو کھولا جائے اور اس میں سونا چاندی یا ہیرا جو بھی ٹنکا ہوا ہے۔ اسے نکال لیں۔ بعد میں بہانہ کردیں گے چوہے کھا گئے یا پرانے ہو کر جھڑ گئے۔ ادھر دادی جان کا یہ حال تھا کہ بستر علالت پر بھی دادی جان اسے بھول نہ سکی تھیں۔ وہ بار بار کہتیں۔ "دیکھنا' کہیں میرا سامان زیادہ دیر تک دھوپ میں نہ پڑا رہ جائے۔"

چچی جان کو شاید خود بھی تجسس تھا۔ جبھی تو موقع پاتے ہی انہوں نے پیکٹ کو کھول لیا۔ اندر سے بہت پرانا بوسیدہ سا کمبل برآمد ہوا۔ جس پر نہ سونے کا کام تھا' نہ چاندی کے تار لگے تھے' نہ ہی ہیرے جڑے تھے۔ البتہ جگہ جگہ سے اس کے پھٹے ہوئے حصوں کو سلائی کے ذریعے جوڑا گیا تھا۔ ہم سب بڑے اشتیاق سے اور حیرت سے اسے الٹ پلٹ کر کھینچ تان کر دیکھ رہے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمارے ارمانوں پر اوس پڑ گئی تھی۔ بلال نے دوڑ کر دادی اماں کو اطلاع دی۔

"دادی جان۔ دادی جان ..... وہ ..... وہ آپ کا کمبل ....."

"سارا سونا چوہے کھا گئے اور دادی جان ..... ایک ..... لال بیگ کا بچہ بھی نکلا تھا۔"

بلال پھولی ہوئی سانسوں سے جلدی جلدی دادی جان کو بتا رہا تھا۔

"ارے .... ارے کس نے کھول دیا اسے' دلہن .... دلہن ....."

دادی اماں شدید بیماری کی حالت میں بھی جلدی سے اٹھ کر بستر پر بیٹھ گئیں اور چچی جان کو آوازیں دینے لگیں۔ چچی جان کے پہنچنے سے پہلے ہم سب بہن بھائی کمبل اٹھائے ہوئے دادی جان کے پاس پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے جو دیکھا کہ ان کے نو دس پوتے پوتیاں ان کا یادگار کمبل اٹھائے گرتے پڑتے چلے آرہے ہیں تو انہوں نے لپک کر کمبل اپنے کانپتے ہاتھوں میں تھام

لیا۔

"دادی..... دادی..... سوراخ..... سوراخ۔"

ڈھائی سالہ نومی نے کمبل کے ایک پھٹے حصے کی طرف اپنی توتلی زبان میں اشارہ کیا۔

"کس نے کھولا اسے.....؟" دادی اماں نے غصے سے پوچھا

"اماں..... میں نے کھولا ہے۔ دھوپ لگانے کے لئے۔ عجیب سی بو آرہی تھی اس میں سے۔ اماں اب اسے کسی فقیر کو دے دیجئے یہ کسی کام کا نہیں ہے۔"

"ہائے ہائے ۔ کیا کہا"..... دادی جان کا چہرہ لال ہوگیا۔

"فقیر کو دے دوں..... دلہن مجھے بھی اٹھا کے فقیر کو دے دو۔ میں بھی بہت بے کار اور پرانی ہوں۔"

"ارے اماں آپ تو ناراض ہونے لگی ہیں۔ ثوبیہ کا یہ مطلب تھا کہ کسی ضرورت مند کے کام آجائے گا۔" ابو جان نے دادی اماں کا غصہ ٹھنڈا کرنا چاہا۔

"تم نہیں جانتے ..... اس کمبل سے..... اس کمبل سے کتنی یادیں لپٹی ہیں۔"

"جب ہم بالکل بے آسرا تھے اور اللہ کا نام لے کر ننگے پاؤں اس مٹی کی طرف چلے تھے۔ سردی سے تھر تھر کانپ رہے تھے۔ تب..... تب یہ کمبل ہمارے کام آیا تھا۔ اس وقت بہت سے لوگوں کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ میں نے اور تمہارے دادا نے اسے اوڑھا ہوا تھا اور اس طرح ہم پاکستان آئے تھے' یہاں آکر بھی اسے ہی اوڑھتے اسے ہی بچھاتے تھے۔ میں..... میں کیا کیا بتاؤں کہ کیا ہوا تھا اور کیسے ہوا تھا۔ تم کچھ نہیں سمجھ سکتے۔ تمہیں تو ہر چیز بنی بنائی تیار مل گئی ہے۔ اس لئے نئے پرانے کا شور مچاتے ہو۔"

وہ تیز تیز سانسوں کے درمیان بولتی جارہی تھیں۔ ان کا سانس پھول گیا تھا پھر وہ بستر پر لیٹ گئیں اور وہی پرانا کمبل اوڑھ لیا۔ سب چپ چاپ دم سادھے کھڑے دادی اماں کی باتوں کو سمجھنے کی کوشش کررہے تھے' کچھ دیر بعد چچی جان کی آواز نے خاموشی کو توڑا وہ کہہ رہی تھیں۔

"اماں..... سوری..... مجھے معاف کردیجئے۔"

باربار سوری کہنے کے باوجود دادی اماں کچھ نہ بولیں تو چچی جان نے ان کے چہرے پر سے کمبل اٹھایا۔ اور ایک ہلکی سی چیخ مار کر الگ ہوگئیں۔ چچا جان آگے بڑھے۔ تھوڑی دیر تک انہیں ٹٹولتے رہے پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔ "اماں ہم سب سے خفا ہوگئیں۔" ابو کو جیسے سکتہ سا ہوگیا تھا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو

جاری تھے۔ کچھ دیر بعد وہ آگے بڑھے۔ انہوں نے وہی بوسیدہ کمبل اٹھا کر اپنی آنکھوں سے لگالیا۔ دیر ہوگئی تو میں نے بڑھ کر ابو کے ہاتھوں سے کمبل لے لیا۔ ابو کے آنسوؤں نے کمبل کا ایک بڑا حصہ گیلا کردیا تھا۔ میں نے حیرت سے ایک نظر کمبل کو اور پھر ابو کو دیکھا تو انہوں نے اٹک کر کہا :

"بیٹے اس کمبل کو سنبھال کر رکھ لو اور یاد رکھنا کہ تمہارے ابو وہی کہہ رہے ہیں جو تمہارے دادا نے کہا تھا کہ "اس میں ہیرے جڑے ہوئے ہیں۔"

●●●

آج کے بچے

موجودہ حالت کو سامنے رکھا جائے تو انتہائی تشویشناک صورتحال سامنے آتی ہے۔ مختلف بیماریوں، غذا اور مناسب سہولتوں کی کمی کے باعث ہر سال لاکھوں بچے موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں اور لاکھوں کی تعداد میں معذور ہوجاتے ہیں۔ جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے تو بعض اسباب کی بناء پر پاکستان میں بچوں کی صورت حال دیگر ممالک کے مقابلے میں کہیں زیادہ تشویشناک ہے۔ آبادی کے لحاظ سے پاکستان دنیا کا آٹھواں بڑا ملک ہے۔ اس وقت پاکستان کی آبادی تقریباً 13 کروڑ (13,00,00,000) ہے جبکہ آبادی میں اضافہ کی شرح 2ء9 فیصد ہے جو دنیا میں سب سے زیادہ ہے۔ اعداد و شمار کے مطابق پاکستان میں پیدا شیرخواری کی عمر میں مختلف بیماریوں کے باعث ہلاک ہوجاتے ہیں۔ ہر دس میں سے ایک بچہ اپنی پہلی سالگرہ منانے سے پہلے ہی دنیا سے رخصت ہوجاتا ہے۔ بات یہی ختم نہیں ہوتی بلکہ ہمارے ملک میں 5 سال سے کم عمر کے بچوں کی ہلاکت کا تناسب فی ہزار 137 ہے اگر مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اوسطاً ہر روز 1800 بچے موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں۔ جبکہ روزانہ ہر گھنٹے میں 75 بچے ملکِ عدم روانہ ہوجاتے ہیں اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ یہ ہلاکتیں ایسی بیماریوں کے باعث ہوتی ہیں جن کا علاج ممکن ہے اور اس پر زیادہ اخراجات بھی نہیں آتے۔ پاکستان میں پیدا ہونے والے 25 فیصد بچے حفاظتی ٹیکوں سے محروم رہتے ہیں۔

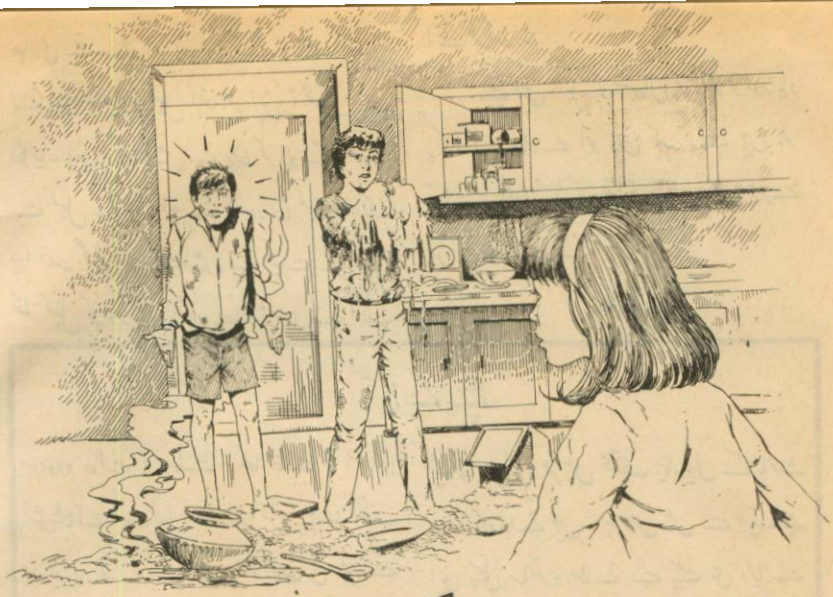

جس کا نام

کمال احمد حاذم

صرف چار دن کی بات تھی۔ مکرم، معظم اور سمیرا کے امی ابو کو اچانک کام سے باہر جانا پڑ گیا۔ ایک پڑوسی کو وہ ان بچوں کا خیال رکھنے کے لئے کہہ گئے اور بچوں کے لئے یہ طے کر گئے کہ ان کی غیر حاضری میں دونوں بھائی بازار سے سودا سلف لانے کا بھی کام کریں گے اور گھر کے کام کاج میں سمیرا کی مدد بھی کریں گے۔ لیکن پہلے ہی دن چخ چخ شروع ہو گئی۔ دونوں بھائی ایک طرف تھے اور بے چاری سمیرا ایک طرف ..... سمیرا کو تو انہوں نے اتنا تنگ کیا کہ وہ بے چاری رو پڑی۔

وہ باورچی خانے سے آواز لگاتی ہے "مکرم بھیا..... ذرا آٹے کے ٹب میں سے تھوڑا سا آٹا تو نکال لانا۔" لیکن مکرم صاحب ہیں کہ سنتے ہی نہیں۔

وہ باورچی خانے میں کام میں مصروف ہے

اور معظم کو پکارتی ہے۔ "معظم بھیا ..... ماچس کی ڈبیا ختم ہوگئی ہے۔ ذرا دوڑ کر ایک ماچس تو لے آنا۔" لیکن معظم صاحب کے کان پر جوں نہیں رینگتی۔

اور وہ بے چاری بڑبڑاتی' خود ہی سب کام کرلیتی اور اس پر لطف یہ کہ دونوں بھائی بعد میں اس سے کہتے "ارے کیا ہوا جو خود کرلیا تو ..... کونسا مشکل کام تھا ..... اونہہ" شام تک یہ چخ چخ باقاعدہ جھگڑے کی صورت بھی اختیار کرگئی۔ کام کی تقسیم کا جھگڑا تھا۔ ان دونوں نے اپنی اپنی جگہ یہ ثابت کرنے کی پوری پوری کوشش کی کہ ان دونوں کا کام زیادہ ہے اور سمیرا کا کم۔

"گھر میں بیٹھ کر صرف روٹی ہی تو پکانی ہوتی ہے ..... اور کیا کرنا ہوتا ہے.....؟" اور ہمیں بازار ترکاری لانے' دودھ لانے اور نہ جانے کتنی چیزیں لانے کے لئے جانا پڑتا ہے اور اوپر سے یہ اٹھادو..... وہ کردو..... اونہہ۔"

وہ دونوں اپنی ہی کہے جارہے تھے اور سمیرا بے چاری آنسو بہارہی تھی۔ اچانک مکرم بولا۔ "اچھا چلو تم بازار کے کام کرو اور باورچی خانہ ہم سنبھال لیں گے۔ دوسرے گھر کے کام بھی ہم کرلیں گے۔ کیوں معظم.....؟"

"ٹھیک ہے اسے بھی تو پتہ چلے کہ بازار کا کام کتنا مشکل ہوتا ہے۔ ٹانگیں تھک جاتی ہیں۔" اور فیصلہ ہوگیا۔

دوسرے دن صبح سمیرا بازار کو چل دی اور مکرم اور معظم باورچی خانے میں ڈٹ گئے۔ مکرم بولا۔ "تم ذرا جلدی سے آٹا گوندھ لو۔ گیس بند ہے نہ معلوم کب آئے جب تک میں آگ جلا لیتا ہوں اور پھر ترکاری بناڈالیں گے۔ اور جب سمیرا آئے گی تو چائے بنالیں گے۔"

"اچھا ....." معظم نے کہا اور جلدی سے آٹے کے ٹب کی طرف لپکا۔ معظم ایک بڑے تھال میں آٹا نکال لایا اور ادھر مکرم لکڑیاں لے آیا اور چولہا جلانے بیٹھا۔ معظم نے تھال میں آٹا لے کر پاس رکھے برتن سے پانی انڈیل دیا۔ جب آٹے کو گوندھنے لگا تو معلوم ہوا کہ پانی زیادہ ہے۔ جس کی وجہ سے آٹا پتلا ہوگیا ہے۔ اب اسے گاڑھا کرنے کا ایک ہی طریقہ تھا اور وہ طریقہ اس کے دماغ میں فوراً آگیا۔ اس نے تھالی اٹھائی اور آٹے کے ڈرم کی طرف بھاگا۔ دونوں ہاتھوں سے مٹھیاں بھر کے اس نے دو تین بار آٹا نکالا' گیلے آٹے میں ملایا۔ اب گوندھنے پر معلوم ہوا کہ آٹا زیادہ سخت ہوگیا ہے اور اس میں پھر پانی ملانے کے ضرورت ہے! اس نے پھر برتن انڈیل کر پانی ڈالا اور پانی پھر زیادہ ہوگیا اور

اسے مزید سوکھا آٹا ملانا پڑا۔ اب کی بار بھی آٹا اگرچہ سخت تھا لیکن اس نے یونہی رہنے دیا۔ اس خیال سے کہ کہیں پھر پانی زیادہ نہ ہو جائے!

ادھر مکرم ابھی تک آگ نہیں جلا پایا تھا۔ وہ دیا سلائی کی ایک پوری ڈبیا پھونک چکا تھا۔ چار اخباروں کی ردی جلا چکا تھا۔ لیکن لکڑیاں تھیں کہ آگ ہی نہیں پکڑ رہی تھیں۔ وہ پھونکیں مار مار کر بے حال ہو گیا تھا۔

معظم نے جو یہ دیکھا تو کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ "ارے جاؤ تمہیں تو لکڑیاں بھی جلانی نہیں آتیں۔" وہ آٹا گوندھنے کے متعلق اپنی پریشانی بھول چکا تھا۔ مکرم کھسیانا سا ہو کر بولا۔ "میں کیا کروں..... لکڑیاں گیلی ہیں۔"

"گیلی نہیں ہیں یار۔ تم نے مٹی کا تیل نہیں ڈالا..... امی تو مٹی کا تیل ڈال کر جلایا کرتی ہیں.... ہاں۔"

اور اب مٹی کے تیل کی تلاش شروع ہوئی۔ بوتل ملی، لیکن خالی تھی، مکرم کو یاد آیا گذشتہ شام سمیرا نے مٹی کا تیل لانے کے لئے کہا تھا۔ لیکن وہ ٹال گیا تھا۔ اب کیا ہو سکتا تھا یا تو دونوں میں سے ایک بھاگ کر مٹی کا تیل لائے یا پھر کاغذوں ہی کی مدد سے دوبارہ آگ جلانے کی کوشش کی جائے۔ بازار جانے کا موڈ دونوں میں سے کسی کا نہ تھا۔ کاغذوں ہی کی مدد سے آگ جلانا ٹھیک سمجھا گیا اور ڈھیر سارے کاغذ لکڑیوں کے نیچے رکھ کر آگ دکھا دی گئی۔ اس بار آگ کو جیسے ان پر رحم آگیا ہو۔ اس نے لکڑیوں کو اپنی لپیٹ میں لے ہی لیا اور انہوں نے اطمینان کی سانس لی۔

"آؤ اب ترکاری بنا ڈالیں....."

مکرم نے کہا اور معظم سامنے شیلف پر سے سبزی کی ٹوکری اٹھا لایا۔ ترکاری چڑھاتے وقت نمک مرچ ملانے کا مسئلہ درپیش تھا۔ مکرم نمک ڈالنے لگا تو معظم بولا۔ "اتنا نمک.....؟ ترکاری زہر ہو جائے گی..... ہاں....."

"تو یہ لو پھر تم ڈال لو..... جتنا تم مناسب سمجھو ڈال لو۔" مکرم جھنجھلا کر پیچھے ہٹ گیا۔ معظم نے دو چمچے نمک ڈالے لیکن اسے اطمینان نہ ہوا تو ایک چمچ اور ڈال دیا۔ لیکن اب بھی اس نے یہی سوچا نمک کم ہے اس نے مزید ایک چمچ ڈال دیا اور پھر تین چمچے مرچ بھی ڈال دی۔ یہ دیکھ کر مکرم نے ناک بھوں چڑھائی۔

"بہت کڑوی بنے گی یار۔"

"ارے تم دیکھنا تو سہی..... تم انگلیاں چاٹتے نہ رہ گئے تو میرا نام معظم نہیں۔"

پتیلی کو آگ پر چڑھا کر دونوں مطمئن ہو گئے۔

"بس اتنی سی بات تھی ..... سمجھتی تھی کہ کام بہت کرتی ہے....." مکرم نے کہا اور معظم نے "ہوں ...." کہہ کر سر ہلادیا اور پھر دونوں نے مارے خوشی کے گانا شروع کردیا ..... ایک گانا .... دو گانے .... تین گانے ..... جانے کتنے گانے گاچکے ..... کبھی مکرم معظم کو سناتا اور کبھی معظم، مکرم کو ..... اور جب زیادہ جوش آتا تو دونوں مل کر گانے لگتے ..... باورچی خانہ اچھا خاصا میوزک روم بن گیا تھا..... کبھی چمچہ اور گلاس بج رہے ہیں تو کبھی تھالی پیٹی جارہی ہے ..... کبھی برتنوں پر "تھپ تھپ" ہورہی ہے تو کبھی چمٹا بجایا جارہا ہے ..... اور انہیں پتہ ہی نہ چلا کہ کتنا وقت گزر گیا ہے ..... اچانک چولہے پر رکھی ترکاری کے جلنے کی بو آئی ..... معظم اٹھا اور جلدی سے بغیر کپڑے کی مدد کے اس نے پتیلی اتار ڈالی پھر وہی ہوا جو ہونا تھا اس کا ہاتھ جھلس گیا اور وہ پتیلی رکھ کر "سی سی" کرتا ہوا پرے جا کھڑا ہوا اور پھونکوں سے انگلیوں کو سہلانے لگا۔

مکرم نے چمٹے کی مدد سے پتیلی کا ڈھکن گرایا تو ترکاری نیچے سے جلی ہوئی نظر آئی۔ "ارے ..... یہ کیا ہوگیا؟ اب کیا کیا جائے .....؟" کافی سوچ بچار کے بعد فیصلہ ہوا کہ ترکاری میں کچھ پانی ملا کر پھر سے آگ پر چڑھا دیا جائے تاکہ کچھ شوربہ بنے ..... چنانچہ ایک گلاس پانی ڈال کر پتیلی پھر سے آگ پر چڑھادی گئی۔

"اب اسے ساتھ ساتھ ہلاتے بھی جاؤ ..... میں ذرا ہاتھ پر مرہم لگالوں ..... بہت جلن ہورہی ہے۔" اور معظم دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

مکرم چمٹا لے کر پتیلی کے پاس بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے پتیلی کا ڈھکنا کھول کر ہٹانا چاہا تو پتیلی کھٹ کی آواز کے ساتھ چولہے میں جا گری۔ ہوا یہ تھا کہ دوبارہ رکھتے وقت، پتیلی چولہے پر ٹھیک طرح سے نہیں رکھی گئی تھی۔ کچھ ترکاری آگ میں جا گری اور کچھ باہر فرش پر..... آگ بجھ گئی اور باورچی خانے میں دھواں پھیل گیا۔

معظم انگلی پر مرہم لگا کر اور پٹی باندھ کر باورچی خانے کی طرف آیا۔ انگلی میں اب بھی جلن ہورہی تھی اور وہ "سی سی" کررہا تھا۔ باورچی خانے میں دھواں اور پتیلی کو اوندھے منہ چولہے میں دیکھ کر اسے ایک دم غصہ آگیا۔

"یہ کیا کیا تم نے.....؟" وہ غصے میں بولا۔

"میں نے کیا کیا ..... پتیلی لڑھک گئی۔" مکرم کو بھی غصہ آگیا۔

"لڑھک کیسے گئی تم نے ہی لڑھکادی ہوگی۔" معظم نے غصے سے کہا۔

سچے موتی

- ..... جس بچے پر ہر وقت تنقید کی جاتی ہے، وہ ہر چیز کو رد کرنا سیکھتا ہے۔
- ..... جس بچے کا ہر وقت مذاق اڑایا جاتا ہے، وہ بزدل بن جاتا ہے۔
- ..... جس بچے پر ہر وقت غصہ اتارا جاتا ہے، وہ لڑائی پسند ہو جاتا ہے۔
- ..... جس بچے سے ہر وقت شفقت برتی جاتی ہے، وہ محبت کرنا سیکھتا ہے۔
- ..... جس بچے کی تربیت علمی ماحول میں ہوتی ہے، وہ ذہانت سیکھتا ہے۔
- ..... جس بچے کو سچ بولنا سکھایا جاتا ہے، وہ انصاف کرنا سیکھتا ہے۔
- ..... جس بچے کی ہر وقت حوصلہ افزائی کی جاتی ہے، اس میں اعتماد بڑھتا ہے!
- ..... جس بچے کو صبر کرنا سکھایا جاتا ہے، وہ برداشت کی قوت سیکھتا ہے۔

"جی ہاں میں نے ہی لڑھکائی ہے ..... بس ...."
مکرم بھی چڑ کر بولا۔
"کوئی کام نہیں آتا تمہیں ....."
"اور تمہیں بہت آتا ہے ....."

اور جب سمیرا بازار سے لوٹی تو دونوں باورچی خانے کے سامنے کھڑے ایک دوسرے کو کینہ توز نظروں سے گھور رہے تھے۔ سمیرا نے دیکھا باورچی خانے میں جلے ہوئے کاغذ اڑ رہے ہیں۔ مکرم کے گال، ناک اور پیشانی پر جابجا کالک لگی ہوئی ہے ..... معظم کی انگلیوں پر پٹی بندھی ہے۔ دونوں کے کپڑوں پر ہلدی اور چکنائی کے بے شمار داغ ہیں۔ باورچی خانے کے ایک کونے میں رکھی تھالی میں آٹا گوندھا رکھا ہے۔ جو مقدار میں اس سے تین گنا ہے جو سمیرا گوندھتی تھی ..... اور کھلا رکھنے کی وجہ سے اس پر راکھ جمع ہوگئی تھی ..... کچھ ترکاری چولہے میں پڑی تھی اور کچھ فرش پر ..... شوربہ فرش پر بہہ کر پتلی پتلی سی نالیاں بنا رہا تھا - یہ دیکھ کر پہلے تو وہ حیران ہوئی، پھر اسے غصہ آیا لیکن پھر جو ہنسی چھوٹی ہے تو وہ ہنستی ہی چلی گئی۔ مکرم اور معظم دونوں سر جھکائے اندر کمرے میں چلے گئے۔

اس دن تو سمیرا کو بازار کا کام کرنے کے علاوہ باورچی خانے کا کام بھی کرنا پڑا .... لیکن تھوڑی دیر بعد جب اس نے ایک کو آواز لگائی تو دونوں دوڑے چلے آئے۔ سنا ہے کہ اب اکثر یہی ہوتا ہے۔ وہ ایک کو بلاتی ہے تو دونوں چلے آتے ہیں۔ بلکہ کبھی تو بغیر بلائے ہی بہن کے پاس آکر بیٹھ جاتے ہیں۔ شاید کچھ سیکھنے کے لئے۔

●●

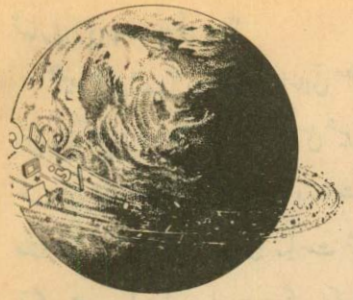

قصہ کوئز 7

قصہ کوئیز تاریخ کے نئے اوراق کے ساتھ حاضر ہے۔ بہ غور پڑھیے۔ تاریخی واقعات کا لطف بھی اٹھایئے، معلومات میں اضافہ بھی کیجئے اور پھر پوچھے گئے سوالات کا جواب بھی دیجئے۔ اپنے جواب جلدی بھجوا دیجئے۔ دیکھیں اس بار آپ اس مقابلے میں کتنے سوالات کا جواب درست دے پاتے ہیں۔ (مرتب)

(الف) ہندوستان پر مغلوں کی حکومت پورے عروج پر تھی۔ مغل بادشاہ نورالدین محمد جہانگیر کا طوطی طول و عرض میں بولتا تھا۔ ایک روز گوری رنگت والا ایک بدیسی شخص دہلی کے دربار میں حاضر ہوا اور اپنے بادشاہ جیمز اول کی طرف سے قیمتی تحائف پیش کرکے بادشاہ کے دل میں اپنے لئے نرم گوشہ پیدا کرلیا۔ یہ شخص تین برس تک دربار شاہی میں حاضری دیتا رہا اور اس عرصے میں بادشاہ کی عادات، مزاج اور نفسیات کا مطالعہ کرتا رہا۔ آخرکار ایک روز موقع پاکر اس نے ہندوستان کے شہر سورت میں تجارت کی غرض سے کوٹھی قائم کرنے کی اجازت چاہی۔ یہ درخواست قبول کرلی گئی۔ یہی اجازت آگے چل کر پورے ہندوستان کو غلامی کی زنجیریں پہنا گئی۔

(ا) کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ وہ شخص کون تھا جسے دربار شاہی تک رسائی حاصل ہوئی؟

(۲) تجارتی کوٹھی کے قیام سے ایک بڑی کمپنی کے قیام کی راہ ہموار ہوئی۔ جس نے ہندوستان پر قبضے کا عملی کام کیا۔ اس کمپنی کا نام کیا تھا؟

(ب) اس نے کہا "جس وقت تم اپنی ایک انگلی سے دوسروں کی طرف اشارہ کررہے ہوتے ہو عین اس وقت بقیہ چار انگلیاں خود

تمہاری اپنی جانب ہوتی ہیں۔"

عظیم فلسفی، مدبر، روحانی اور اخلاقی معلم۔ اس نے کبھی مذہبی پیشوا ہونے کا دعویٰ نہیں کیا مگر مذہبی پیشواؤں کی طرح مانا گیا اور بہت بڑا حلقۂ اثر پیدا کرلیا۔ چین کی ریاست شان نونگ میں پیدا ہوا۔ ریاست سونگ کے اعلیٰ عہدوں پر بھی فائز رہا۔ ایام جوانی عمیق مطالعے اور گہرے مشاہدے میں بسر ہوئے۔ بعد کا عرصہ اخلاقی تعلیمات دیتے ہوئے گزرا اس نے سچائی، پاکیزگی اور دیانت داری کا درس دیا اور لوگوں کی نظریاتی تربیت کی۔

وہ کہتا تھا کہ "انسان کائنات کا مرکز ہے اور انسان کی ذات میں اعلیٰ کردار کے جوہر پوشیدہ ہیں۔ اگر انسان چاہے تو اپنے ان جوہروں کو دریافت کرسکتا ہے؟

(ا) ہم کس شخصیت کا ذکر کررہے ہیں؟

(ب) کیا آپ اس شخصیت کی اس کتاب کا نام بتا سکتے ہیں جو اس سے منسوب ہے؟

(ج) سمرقند کا ایک بادشاہ شہریار اپنی بیوی کے رویئے سے ایسا نالاں ہوا کہ اس نے عورت ذات سے انتقام لینے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ جس عورت سے بھی شادی کرتا اسے اگلے روز ہی قتل کردیتا۔ بے گناہ عورتوں کے قتل کا سلسلہ طول پکڑ گیا تو اس کے ایک دانا وزیر کی بیٹی کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ وہ اپنی طرح کی لڑکیوں کو اس عذاب سے نجات دلائے۔ اس نے بہ مشکل تمام اپنے باپ کو راضی کیا اور خود بادشاہ سے شادی کرلی۔ شادی کی رات اس نے بادشاہ کو ایک کہانی سنانا شروع کی۔ کہانی اتنی دلچسپ تھی کہ رات ختم ہوگئی مگر نہ تو کہانی ختم ہوئی اور نہ کہانی کی دلچسپی۔ بادشاہ نے کہانی کا اگلا حصہ سننے کے لئے اس کے قتل کا ارادہ ملتوی کردیا مگر کہانی تو دوسری رات بھی ختم نہ ہوئی اور کہانی میں پہلے سے زیادہ دلچسپی پیدا ہوگئی۔ پھر اس نے ہر رات ایک کہانی سناکر اس طرح ختم کی کہ اس سے زیادہ دلچسپ ایک اور کہانی کا آغاز اسی رات کردیا اور اسے پھر ادھورا چھوڑ دیا۔ اس طرح ایک ہزار ایک راتوں تک وہ کہانی سناتی رہی۔ اس عرصے میں وہ خود دو بچوں کی ماں بن گئی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بادشاہ کی بدظنی بھی جاتی رہی اور اس کا رویہ بھی درست ہوگیا۔

(ا) یہ روایت غلط یا درست، مگر تاریخ ادب کا

حصہ ہے۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ ہم اور آپ ان کہانیوں کو کس نام سے جانتے ہیں؟

(۲) یہ کہانیاں کس خطے میں تخلیق ہوئیں؟

(د) سترہ برس کی عمر میں وہ مصر کی ملکہ بنی اور اس کا بھائی مصر کا بادشاہ، مگر دونوں کی حکومت زیادہ عرصہ نہ چل سکی۔ انہی دنوں روم کا ایک جنرل اپنی فوجوں کے ساتھ مصر کی سرحدوں تک پہنچ چکا تھا۔ اس جنرل کو جب یہ خبر ہوئی کہ ملکہ اور بادشاہ کے باہمی تعلقات اچھے نہیں ہیں تو اس نے ملکہ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی اور اسے ایک خفیہ پیغام بھجوایا۔ ملکہ خود بھی رومی جنرل سے ملنا چاہتی تھی مگر اس ملاقات کا راز میں رہنا ضروری تھا۔ لہٰذا اس نے اپنے بااعتماد غلام اپولوڈورس کے ساتھ ایک پروگرام بنایا۔ وہ خود ایک قالین پر لیٹ گئی اور غلام نے اس کے گرد قالین لپیٹ کر اسے اس طرح اٹھا لیا کہ کسی کو گمان تک نہ ہوا۔ غلام قالین میں لپٹی ہوئی ملکہ کو ایک کشتی کے ذریعہ لے کر سکندریہ پہنچ گیا۔ رومی جنرل کے محافظوں کو یہی بتایا گیا کہ وہ پڑوس کی سلطنت کے بادشاہ کا تحفہ لے کر آیا ہے۔ رومی جنرل کے سامنے قالین کھولا گیا تو ملکہ ظاہر ہوئی۔ رومی جنرل اس ملکہ کا محافظ اعلیٰ بن گیا اور اس نے مصر کا تاج و تخت واپس ملکہ کو دلوایا۔

(ا) کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ مصر کی اس مشہور ملکہ اور اس کا محافظ قرار پانے والے کا نام کیا تھا؟ (دونوں نام بتائیے)

(۲) خود اس ملکہ کی موت کیسے واقع ہوئی؟

(ح) ۱۶ جولائی ۱۹۶۹ء کو کیپ کینڈی (امریکہ) سے ایک خلائی جہاز راکٹ کے ذریعہ آسمانوں کی بلندی کی طرف روانہ ہوا۔ اس میں تین افراد سوار تھے۔ انسانی تاریخ میں پہلی بار انسان کو یہ اعزاز حاصل ہونے والا تھا کہ چاند اس کے قدموں تلے آجائے گا۔ زمین کے مدار سے نکل کر راکٹ نے جہاز کو علیحدہ کردیا اور اب جہاز چار ہزار دو سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چاند کی طرف بڑھنے لگا۔ یہ حیرت انگیز منظر دنیا کے لاکھوں لوگ اپنے ٹیلی ویژن سیٹ پر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ پوری دنیا کے لوگ اس ایک واقعے کو بہ یک وقت دیکھ رہے تھے۔ اس موقع پر دنیا پہلی مرتبہ "گلوبل ویلج" کہلائی۔ ۱۹ جولائی کو یہ

خلائی جہاز چاند کے مدار میں داخل ہوا تو ایک قمری گاڑی کے ذریعے یہ خلاباز چاند پر اتر گئے۔ نیل آرمسٹرانگ کا قدم چاند پر لگتے ہی انسان نے کامیابی کا ایک غیر معمولی سفر طے کرلیا۔

(۱) یہ بتایئے کہ نیل آرمسٹرانگ کے بقیہ دو ساتھیوں کے نام کیا تھے؟

(۲) دوسرے خلاباز نے پہلے خلاباز کے کتنی دیر بعد چاند پر قدم رکھا؟

گذشتہ مقابلے (قصہ کوئیز) کے درست جوابات

(الف) (۱) آب زم زم

(۲) حضرت ہاجرہؑ، حضرت اسماعیل علیہ السلام

(ب) (۱) بھاپ کا انجن

(۲) جارج اسٹیفن سن

(ج) (۱) آواز دوست، مختار مسعود

(۲) لوح ایام

(د) (۱) منجنیق

(۲) عروس

(ح) (۱) لینن

(۲) اسٹالن

قرعہ اندازی کے ذریعے انعام پانے والے تین خوش نصیب ساتھی

(۱) لبنیٰ رفیع۔ منڈی مرید کے

(۲) ساجدہ پروین۔ کمالیہ ٹوبہ ٹیک سنگھ

(۳) محمد جنید سلیم، حیدر آباد

تمام درست جوابات دینے والے ساتھی

(۱) محمد ایوب منظر، شاہدرہ لاہور

(۲) شرجیل ظفر، کمالیہ

(۳) مشتاق احمد، دیپال پور، اوکاڑہ

(۴) محمد فیاض، گلبرگ لاہور

(۵) محمد علی جواد، لاہور نمبرا

(۶) پرویز اسلام، ساندہ روڈ، لاہور

(۷) امتیاز علی ناز، والٹن لاہور

(۸) محسن ریاض، حیدر آباد

(۹) زہرہ شکیل، اسلام پورہ لاہور

(۱۰) خرم شیرازی، بھکر

(۱۱) زاہد شیرازی، بھکر

(۱۲) فاخرہ شیرازی، کراچی

(۱۳) کلثوم جعفری، کراچی

(۱۴) نور محمد، علی پور چٹھہ، گجرانوالہ

(۱۵) محمد راحیل بن یحییٰ، قاسم آباد، حیدر آباد

--- ☆ ---

قلم دوست

روشنی

عبداللہ بن عامرؓ سے روایت ہے کہ ایک دن جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے گھر تشریف فرما تھے میری والدہ نے مجھے پکارا اور کہا "بڑھ کے آ میں تجھے کچھ دوں گی۔" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری ماں سے فرمایا۔ "تم نے اس بچے کو کیا چیز دینے کا ارادہ کیا ہے؟" میری ماں نے عرض کیا۔ "میں نے اس کو ایک کھجور دینے کا ارادہ کیا ہے۔" حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "یاد رکھو اگر اس کہنے کے بعد تم اس بچے کو کوئی چیز نہ دیتیں تو تمہارے نامۂ اعمال میں جھوٹ لکھا جاتا۔" (سنن ابوداؤد)

اسلام کا قلعہ

مرسلہ: سہیل احمد خان، جدون

آج دل کی بات کہتا ہوں تمہیں
اک نیا پیغام دیتا ہوں تمہیں
اپنے پاکستان کی یہ سر زمیں
کیسی دلکش، کتنی رنگیں اور حسیں
ملک دنیا میں کوئی ایسا نہیں
اس کے دم سے اپنی روشن ہے جبیں
اک قلعہ ہم نے بنایا ہے حسیں
اس کی بنیادوں میں ہے عزم و یقیں
اس میں شامل ہے شہیدوں کا لہو
قوم ہے اس کی بدولت سرخ رو
یہ قلعہ ہے عالمِ اسلام کا
یہ نشاں ہے امن و استحکام کا
اس قلعے کا نام پاکستان ہے
اس کی خاطر جان بھی قربان ہے

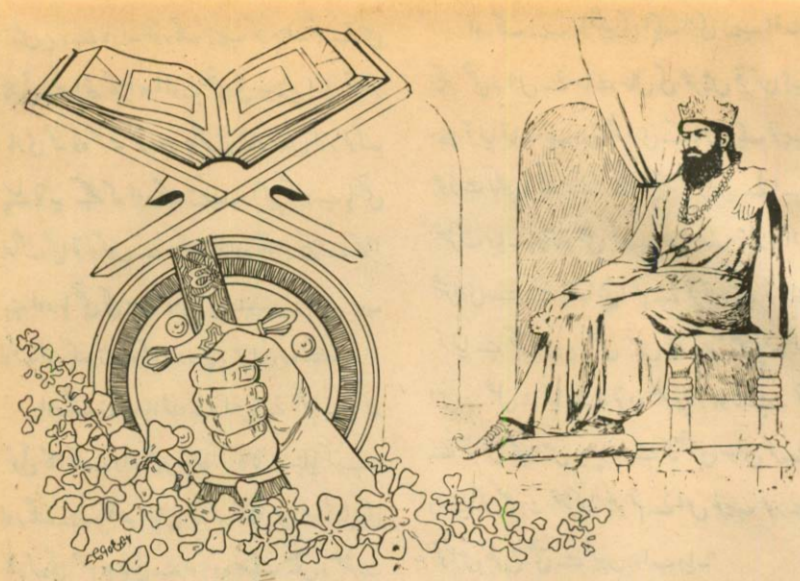

مومن بادشاہ

راھی ریاض احمد — برڑو

اورنگ زیب کے تین بھائی تھے۔

وہ اپنے باپ کا تیسرا بیٹا تھا۔ اپنے دو بھائیوں سے چھوٹا تھا۔ اس کی عمر ۱۴ سال کے لگ بھگ تھی؛

جب ایک دن ان کا باپ شاہ جہاں مست ہاتھیوں کی لڑائی دیکھنے گیا۔ چاروں بیٹے بھی ساتھ تھے۔ یہ سب کے سب گھوڑوں پر سوار تھے۔ میدان کے درمیان مست ہاتھی لڑنے کے لئے چھوڑ دیئے گئے۔ عوام، فوج، شہزادے اور بادشاہ دور ایک دائرے میں کھڑے ہو کر تماشہ دیکھنے لگے۔ اچانک ایک ہاتھی لڑتے لڑتے بھاگ نکلا۔ ہاتھی کو بھاگتے دیکھ کر سامنے کے سارے لوگ اتنے تیز بھاگے کہ پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا جس طرف ہاتھی بھاگا اسی طرف اورنگ زیب بھی کھڑا تھا۔ لوگ بھاگ گئے مگر اورنگ زیب اپنی جگہ سے ذرا بھی نہ ہلا۔ ہاتھی نے آکر اورنگ زیب کے گھوڑے کو سونڈ میں پکڑ کر

زمین پر دے مارا۔ اورنگ زیب گر پڑا۔ گرتے ہی پھرتی سے اٹھ کھڑا ہوا اور ہاتھی کی سونڈ پر ایسی تلوار ماری کہ وہ کٹ کر دور جا گری۔ شاہ جہاں اور لوگ پہلے تو یہ سمجھے کہ اورنگ زیب مارا گیا۔ مگر جب ہاتھی بھاگ گیا تو لوگوں نے دیکھا شہزادہ تلوار پکڑے کھڑا ہے اور ہاتھی کی سونڈ ٹوٹی پڑی ہے۔ یہ دیکھ کر سب لوگ اورنگ زیب کی بہادری پر حیران رہ گئے۔

اورنگ زیب بادشاہ بنا تو اس نے حکم یہ دیا کہ کوئی گانا گانے والا کہیں بیٹھ کر گانا نہ سنایا کرے۔ اورنگ زیب کا یہ خیال تھا کہ گانا سن کر آدمی کی کارکردگی ختم ہو جاتی ہے اور وہ صرف عیش و عشرت میں پڑ جاتا ہے۔ گانے والے میراثیوں نے سوچا کہ "اب ہم کہاں سے کھائیں گے۔ اگر بادشاہ کے پاس جا کر گانے کی اجازت مانگی تو وہ بالکل نہ مانے گا۔"

انہوں نے ایک ترکیب سوچی ایک جنازہ بنا کر روتے پیٹتے بادشاہ کے محل کے نیچے سے گزرے۔ بادشاہ محل سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے پوچھا یہ کس کا جنازہ ہے؟ میراثیوں نے کہا یہ علم موسیقی یعنی گانے کا جنازہ ہے۔ ان کا خیال تھا کہ بادشاہ یہ سن کر شرمندہ ہوگا اور گانے بجانے کی اجازت دے دے گا۔ مگر اورنگ زیب نے یہ سن کر کہا۔"اس کمبخت کو زمین میں بڑا گہرا دبانا تاکہ یہ پھر نہ نکل سکے۔"

اورنگ زیب عالمگیر کی ایک لڑکی زیب النساء بیگم تھی۔ اس نے سات سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا تھا۔ ایک دن شہزادی کے پاس ایک غریب عورت کچھ مانگنے کے لئے آئی۔ شہزادی نے اسے جھڑک دیا۔ بادشاہ بھی قریب کھڑا تھا۔ آگے آکر شہزادی سے کہنے لگا۔"بیٹی! تم نے قرآن مجید تو حفظ کر لیا ہے مگر اس پر عمل نہیں کیا ہے، علم پڑھ کر اس پر عمل نہ کیا جائے تو وہ علم بیکار ہوتا ہے۔ تم نے قرآن مجید میں یہ پڑھا ہے کہ" کسی سوال کرنے والے کو کبھی نہ جھڑکو" پھر تم نے اس غریب عورت کو اس طرح سختی سے کیوں جواب دیا۔"

شہزادی اس پر شرمندہ ہوئی اور باپ سے اپنی غلطی کی معافی مانگی۔

اورنگ زیب شاہی خزانے سے ایک پیسہ بھی نہیں لیتا تھا۔ خود قرآن مجید لکھتا، ٹوپیاں بناتا اور ان کو بیچ کر روٹی کھایا کرتا۔ اس کی ایک ہی بیوی تھی جو اس کے لئے خود کھانا پکایا کرتی۔ اورنگ زیب پکا نمازی تھا۔ ہر روز قرآن مجید کی ایک منزل پڑھا کرتا تھا۔

ایک دن بادشاہ دربار میں بیٹھا تھا کہ ایک آدمی حاضر ہوا اور بادشاہ سے کہا "سرکار میں بہت غریب ہوں میری کچھ مدد کیجئے۔" بادشاہ نے ایک روپیہ دیا۔ وہ آدمی بڑا حیران ہوا، کہنے لگا "میں اتنی دور سے آیا

کھانا

خُوب چبا کر کھائیے

اس لیے کہ

پیٹ میں دانت نہیں ہوتے

اگر

آپ بیماریوں سے بچنا چاہتے ہیں تو

کھانا کھانے سے پہلے

اور

بیت الخلا سے آنے کے بعد

صابن

سے ہاتھ دھونے کو

عادت بنا لیجئے

ہوں اس ایک روپے کو کیا کروں گا۔" بادشاہ نے کہا "یہ روپیہ حلال کی کمائی کا ہے میں نے خود ٹوپیاں بنا کر اس کی اجرت سے کمایا ہے۔ اس میں خدا برکت دے گا۔" ساتھ ہی بادشاہ نے جہاز والوں کو حکم لکھ دیا کہ "اس آدمی کو اس کے وطن مصر پہنچایا جائے۔" جب وہ آدمی بندرگاہ پر پہنچا تو وہاں پر ایک بیوپاری تھا جس کے پاس کئی ٹوکرے کھٹے اناروں کے تھے۔ ان اناروں کو کوئی بھی خریدنے پر تیار نہ تھا۔ اس مصری آدمی نے ایک روپے میں وہ سارے انار خریدے اور جہاز میں رکھ لیے۔

کرنا خدا کا یہ ہوا کہ وہیں سمندر میں طوفان آگیا اور جہاز ہچکولے کھانے لگا۔ جہاز میں جب ہچکولے لگیں تو عام طور پر مسافروں کو قے آنی شروع ہو جاتی ہے اور قے روکنے کے لئے کھٹے انار مفید ہوتے ہیں۔ مسافروں نے اس سے انار خریدنے شروع کئے اور اس کے انار تین ہزار روپے میں بک گئے۔ اب اس آدمی کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ اللہ تعالیٰ حلال کی کمائی میں کتنی برکت دیتے ہیں۔

اس آدمی نے مصر پہنچ کر سارا واقعہ بادشاہ کو لکھا اور ساتھ ہی ان کا شکریہ ادا کیا۔

اورنگ زیب عالم گیر کی قبر دکن کے شہر اورنگ آباد میں ہے۔ اس نے وصیت کی تھی کہ میری قبر کچی بنائی جائے۔

اہم فرض

انور علی، کراچی

وقاص ساتویں جماعت کا طالب علم تھا۔ نہایت ہنس مکھ اور بہت ہی ذہین تھا۔ وقاص بہت کم گو اور پڑھائی میں بہت تیز تھا۔ اس لئے ہر سال اول آتا۔ نماز پابندی سے پڑھتا کبھی دیر سے یا قضا کر کے نہیں پڑھتا تھا اور وہ وقت ضائع کرنے کے بھی خلاف تھا۔ وقاص ہر ایک کو وقت کی پابندی کرنے کے لئے کہتا۔ اسکول کے تھوڑے فاصلے پر ایک درخت تھا۔ اس کے دو قدم کے فاصلے پر ایک حوض بنا ہوا تھا جہاں کئی بکریاں اور بھیڑیں اپنے بچوں کے ساتھ پانی پیتی تھیں۔ اسکول سے چھٹی ہوتے ہی وقاص حوض سے کچھ فاصلے پر کھڑے ہو کر بڑے شوق سے انہیں پانی پیتا ہوا دیکھتا اور پھر قریبی مسجد میں جا کر نماز ادا کرتا تھا۔ آج بھی چھٹی ہوتے ہی وہ حوض کے قریب بیٹھ گیا اور بکریوں کو پانی پیتے ہوئے دیکھنے لگا اسے بکری کا ایک خوبصورت بچہ بہت پیارا لگ رہا تھا۔ وہ چھلانگیں مارتا ہوا کبھی اپنی ماں کے پاس آتا کبھی پانی پینے لگتا۔ وقاص بڑے غور سے اس کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ بچے کو گود میں اٹھائے لیکن اس کی ماں ناراض ہو جاتی۔ اتنے میں ظہر کی اذان ہوئی۔ وقاص نے کپڑے جھاڑے اور کھڑا ہو گیا۔ اتنے میں اس کے کاندھے پر کسی نے ہاتھ رکھ دیا۔ وقاص نے مڑ کر دیکھا تو سامنے اس کا دوست "وآصف" کھڑا مسکرا رہا تھا۔ "ارے آصف کیا بات ہے آج اسکول نہیں آئے؟" وقاص نے پوچھا۔

"بس یار طبیعت کچھ خراب تھی تم سناؤ کہاں جا رہے ہو؟"

"اذان ہو گئی تو ظاہر بات ہے کہ نماز کے لئے جاؤں گا۔" وقاص نے مسکرا کر کہا۔ "آؤ ساتھ نماز پڑھیں گے۔"

"ارے چھوڑو یار قضا کر لیں گے۔" آصف نے ٹالتے ہوئے کہا۔ آصف وقاص کا ہم جماعت تھا دونوں آپس میں گہرے دوست تھے۔ آصف عجیب

چلبلا سا لڑکا تھا شرارت تو اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی نماز وہ بھی پڑھتا تھا لیکن قضا کر کے بہرحال دونوں اچھے دوست اور طالب علم تھے۔

" آصف تم نماز جماعت کے ساتھ کیوں ادا نہیں کرتے ہو یاد ہے اپنے طارق سر کیا کہتے ہیں مسلمانوں کو نماز جماعت کے ساتھ ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔" وقاص نے آصف کو سمجھاتے ہوئے کہا

"ارے! سر طارق تو ہیں عجیب نہ جانے کیا کیا بولتے ہیں۔ تم چھوڑو یہ حوض کے پاس امرود کا درخت دیکھو کتنے پیارے درخت پر امرود لگے ہیں۔" آصف نے امرودوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم امرود توڑو میں نماز کے لئے جاتا ہوں۔" یہ کہہ کر وقاص مسجد کی طرف جانے لگا اور آصف درخت کی طرف بڑھا۔ اسی وقت زور دار چھپاکے کی آواز گونجی اور ساتھ ہی کسی بکری کی "میں میں" کی آواز آنے لگی۔ وقاص اور آصف چونک کر مڑے۔ بکری کا خوبصورت بچہ جسے تھوڑی دیر پہلے وقاص دیکھ رہا تھا حوض سے پانی پیتے ہوئے پھسل کر گر پڑا تھا اور پانی میں ڈبکیاں کھا رہا تھا آصف مزے سے بچے کو ڈوبتے ہوئے دیکھتا رہا۔ وقاص دوڑ کر قریب آیا اور گھبرا کر بولا۔

" آصف جلدی کرو بچے کو نکالو وہ ڈوب رہا ہے۔"

"نہ بابا مجھے کوئی گندا ہونے کا شوق نہیں، دیکھتے نہیں حوض کا پانی ناپاک ہے۔"

"دیکھو وہ مرجائے گا اسے بچالو۔" وقاص نے منت سماجت کرتے ہوئے کہا۔

"ایک بار منع کردیا اور اگر اتنی ہمدردی ہے تو خود پانی میں اتر جاؤ۔" آصف نے انکار کرتے ہوئے کہا اور امرود کے درخت کی طرف بڑھا۔ وقاص نے بکری کے بچے کی طرف دیکھا۔ دوسری طرف جماعت کھڑی ہو چکی تھی اس کے دل و دماغ کے عجیب تاثرات ہونے لگے۔ دماغ اس کو اپنا فرض ادا کرنے کو کہہ رہا تھا اور دل بکری کے بچے کو بچانے کو کہہ رہا تھا۔ بچے کی ماں "میں میں" کرتی ہوئی مدد کے لئے ادھر ادھر دوڑ رہی تھی۔ وقاص سے رہا نہ گیا اور اس نے دوڑ کر حوض میں چھلانگ لگادی۔ وقاص نے بچے کو ہاتھوں میں اٹھالیا اور آہستہ آہستہ حوض سے باہر آگیا۔ حوض کے پانی کی سطح پر لگی کائی نے وقاص کا حلیہ ہی بگاڑ دیا تھا۔ اس نے بچے کو زمین پر رکھ دیا۔ اس کی ماں دوڑ کر آئی اور پیار سے اسے چاٹنے لگی۔

ظہر کی جماعت جا چکی تھی لیکن بکری کے بچے کی جان بچ جانے پر وہ بہت خوش تھا۔ اس کے دل میں یہ اطمینان تھا کہ اس نے ایک اہم فرض ادا کردیا تھا۔

محمد سلیم بخش

تمام انسانوں کا خون خلیات اور مختلف کیمیائی مادوں سے مل کر بنتا ہے۔ ہر شخص کے خون میں کیمیائی مادے اور خلیے مختلف ترتیب میں ہوتے ہیں۔ اس لئے تمام انسانوں کے خون کو چار مختلف گروپوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ یہ گروپ اے بی، اے، بی اور او کہلاتے ہیں۔

خون کے اجزاء میں ۹۱ (اکیانوے) فیصد پانی ہوتا ہے۔ خون میں تین قسم کے خلیے ہوتے ہیں۔ "سرخ، سفید اور پلیٹلس"۔ سفید، خلیے بیماری سے بچاتے ہیں۔ یہ بات روس کے ڈاکٹر "ری مچنی کاف" نے سنہ ۱۸۴۵ء میں ثابت کی تھی۔ خون کے سرخ، جسیمے ایک اطالوی سائنس دان "انٹون فان لیوون لیوک" نے سنہ ۱۶۷۴ء میں دریافت کئے تھے۔

"خون جسم میں گردش کرتا ہے۔"

اس بات کا انکشاف ایک مسلمان سائنس دان "ابنِ نفیس" نے سب سے پہلے کیا۔ پھر بعد میں ایک انگریز سائنس دان "ولیم ہاروے" نے اس بات کو دوبارہ ثابت کیا۔

ایک جوان آدمی کے جسم میں تقریباً" چھ پونڈ خون ہوتا ہے۔ خون ایک مرکب ہیموگلوبین (Haemoglobin) کی وجہ سے سرخ ہوتا ہے۔ خون "رگوں" میں سات (۷) میل فی گھنٹہ کے حساب سے گردش کرتا ہے۔ ہمارے جسم میں ایک دن میں تقریباً" ۱۲۰۰ (بارہ سو) سے ۱۵۰۰ (پندرہ سو) گیلن خون گزرتا یعنی گردش کرتا ہے۔ خون کی یہ تمام گردش دل کی "شریانوں" کے ذریعے اور واپسی "وریدوں" کے ذریعے ہوتی ہے۔

ایک اندازے کے مطابق براعظم، ایشیاء کے لوگوں میں زیادہ تر بی گروپ اور براعظم یورپ کے لوگوں میں زیادہ تر اے گروپ کا خون پایا جاتا ہے۔

شرارت کی سزا

عبداللہ شجاع سندھی

جاہل تھا ایک بچہ لڑنا تھا اس کا کام
پڑھنے سے دور رہ کر تھا کھیل صبح و شام

ہر وقت تھی شرارت ہر وقت مستیاں تھیں
اکثر ہدایتوں پہ کرتا نہ تھا قیام

تھا وہ شریر جاہل آخر ہوا یہ اک دن
چھت سے گرا وہ لنگڑا ہوا دوام

چپ چاپ بیٹھ کر وہ اب بس یہ سوچتا تھا
لنگڑا میں ہوگیا ہوں ٹانگیں ہوئیں تمام

اس سے کسی نے پوچھا کیا حال ہے تمہارا
اس عمر میں یہ تیرا بنتا نہ تھا مقام

رو کر کہا یہ اس نے مجھ کو سزا ملی ہے
اس کام کی جو اکثر کرتا تھا صبح و شام

اس نظم میں شجاع نے سب سے کیا کلام
کرنا نہ تم شرارت ہے نظم سب کے نام

بخار نظر آتا ہے

محمد عثمان (بہاولپور)

مہنگائی کا رکنا دشوار نظر آتا ہے
جسے دیکھو وہ بے قرار نظر آتا ہے

سوچا تھا چل کے توڑیں گے امرود باغ سے
باغ کا مالی مگر بیدار نظر آتا ہے

لگتا ہے وہ چھٹی کرے گا آج اسکول سے
اس کی آنکھوں میں بخار نظر آتا ہے

پوری کلاس پر برس کر بھی نہیں ٹوٹا وہ
مولا بخش بڑا پائیدار نظر آتا ہے

جانے کب ہوگی حلوہ پوری نصیب مجھے
صبح ناشتے میں تو اخبار نظر آتا ہے

ہونے کو تو دس من کا ہے دیوان میرا
شعر میرا ابھی تک ناہموار نظر آتا ہے

قصہ ایک کسان کا

ایم ریاض، لیہ

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک کسان صبح سویرے اپنے کھیتوں میں ہل چلا رہا تھا۔ایک بادشاہ وہاں سے گزرا۔اس نے دریافت کیا کہ "کیا کر رہے ہو؟" کسان نے کہا کہ "زمین کی تیاری کر رہا ہوں۔" بادشاہ نے پوچھا "کیا بیجو گے؟" کسان نے کہا۔ "جو بیجوں گا وہی کاٹوں گا۔"

بادشاہ یہ کہتا ہوا آگے بڑھ گیا کہ "کل صبح میرے دربار میں ضرور آنا۔" کسان یہ بات سنتے ہی پریشان ہوگیا۔' جب شام کے وقت کسان گھر پہنچا تو پریشان حالت میں ٹوٹی ہوئی چارپائی پر لیٹ گیا' اس کی بیوی نے دریافت کیا کہ "آج کیوں پریشان ہو؟" کسان نے کہا۔ "جب میں ہل چلا رہا تھا تو بادشاہ قریب سے گزرا اور پوچھا کیا کر رہے ہو؟" میں نے کہا زمین تیار کر رہا ہوں پھر پوچھا کہ "کیا بیجو گے؟" میں نے کہا جو بیجوں گا وہی کاٹوں گا۔ میری بات سنتے ہی اس نے کہا کل میرے دربار میں ضرور آنا۔ پتہ نہیں بادشاہ کیا سزا سناتا ہے۔" اس کی بیوی نے تسلی دی کہ پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں خدا بہتری کرے گا۔

اگلی صبح اس کی بیوی نے اسے نئے کپڑے پہنا کر بادشاہ کے دربار میں بھیج دیا۔ بادشاہ نے اس سے پوچھا کہ کل میں نے آپ سے کیا سوال کیا اور آپ نے کیا جواب دیا تو کسان نے اپنی بات کو دہرایا۔ بادشاہ نے اسے ایک سو روپے دے کر روانہ کردیا اور یہ بھی کہا کہ روزانہ مجھے یہ بات سنا کر اپنا انعام لے لیا کرو۔ کسان بہت خوش ہو کر گھر چلا گیا' دو ماہ تک یہی سلسلہ جاری رہا۔ ایک دن بادشاہ کے حجام کی نیت خراب ہوگئی اس نے یہ منصوبہ بنایا کہ کسی طریقہ سے اس کا کام بگاڑا جائے اس نے سوچا میں بادشاہ کی خدمت کرتا ہوں تو معاوضہ ملتا ہے وہ ایک بات سناتا ہے اسے سو روپے مل جاتے ہیں۔ ایک دن حجام کسان کے راستے میں کھڑا ہوگیا۔ اس نے کسان سے کہا کہ بادشاہ کہتا ہے کہ کسان کے منہ

سے بو آتی ہے اس سے کہو کہ اپنے منہ پر کپڑا رکھ کر مجھ سے بات کیا کرے۔ کسان نے ایسے ہی کیا۔ بادشاہ نے وہی بات سنی اور رقم دے کر روانہ کردیا۔ دوسرے دن حجام نے بادشاہ کو چمکایا کہ کسان کہتا ہے۔

"بادشاہ کے منہ سے بو آتی ہے اس لئے میں منہ پر کپڑا رکھ کر آتا ہوں۔" اگلے روز جب کسان بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوا تو بادشاہ نے کسان کو پرچی دی اور کہا کہ خزانے میں چلے جاؤ۔ اس پرچی پر لکھا ہوا تھا کہ "فوراً" اس کو پھانسی چڑھا دو۔" راستے میں حجام ملا۔ اس نے بڑی منت سماجت سے پرچی لے لی اور خزانے میں پہنچ گیا چنانچہ حجام کو فوراً" پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ اگلی صبح جب کسان بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوا تو بادشاہ نے پوچھا کہ "پرچی کہاں ہے؟" تو اس نے کہا کہ وہ پرچی مجھ سے حجام نے لے لی ہے۔ اس سے بادشاہ تمام ماجرا سمجھ گیا۔ اس نے بے ساختہ کہا "جو بویا جائے گا وہی کاٹا جائے گا۔"

●●●

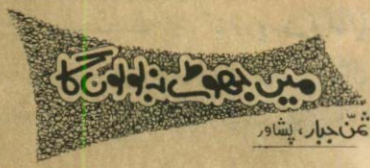

میں جھوٹ نہ بولوں گا

ثمن جبار، پشاور

ایک شریف آدمی نے نہایت شوق سے گھر کے پاس ایک چھوٹا سا باغ لگا رکھا تھا۔ جسے وہ ہر روز اپنے ہاتھ سے سینچتا تھا۔ ایک دن وہ کہیں باہر گیا ہوا تھا کہ اس کا چھوٹا لڑکا ہاتھ میں آری لئے باغ کی سیر کو نکلا اور اس نے آری کو آزماتے آزماتے سب سے اچھا درخت کاٹ دیا۔

شام کو باپ نے آکر باغ کو دیکھا تو اس درخت کو کٹا ہوا پاکر بہت غصہ ہوا اور ہر ایک سے پوچھنے لگا کہ "یہ درخت کس نے کاٹا ہے؟"

اتنے میں بیٹا بھی آگیا۔ باپ نے اس سے پوچھا تو اس نے صاف کہہ دیا۔ "آپ ناراض تو ہوں گے مگر میں جھوٹ نہ بولوں گا یہ درخت میں نے ہی کاٹا ہے۔"

باغ کا شوقین باپ یا تو اتنا غصے ہو رہا تھا یا اس نے نہایت خوشی سے بیٹے کو گود میں اٹھا لیا اور کہا "بیٹا! مجھے تمہاری سچائی سے اتنی خوشی ہوئی کہ درخت کٹ جانے کا رنج اس کے سامنے کوئی چیز نہیں شاباش۔ اسی طرح ہمیشہ سچ بولا کرنا۔" باپ کے اس معاف کردینے اور شاباش دینے کا لڑکے کے دل پر اتنا اثر ہوا کہ اس نے عمر بھر کبھی جھوٹ نہ بولا۔ ہوتے ہوتے اس کی سچائی سارے شہر میں مشہور ہوگئی۔ اس لڑکے کا نام "جارج واشنگٹن" تھا۔ جس نے امریکہ کو آزاد کرایا اور وہی اس بہت بڑے ملک کا سب سے پہلا صدر چنا گیا۔ امریکہ کے صدر مقام کا نام بھی اسی لڑکے کے نام پر رکھا گیا۔

اقرا

خالد بن محمود احمد

درجن بھر تندرست و توانا افراد کے سامنے ایک چھوٹے سے لڑکے کی بساط ہی کیا تھی انہوں نے اسے دبوچا اور اٹھا کر کنویں میں پھینک دیا- معصوم بچے کو انتہائی بے دردی کے ساتھ کنویں میں پھینک دینے والے یہ لوگ کوئی غیر نہیں تھے بلکہ اس کے اپنے بھائی تھے' اس کے باپ کے سگے بیٹے- حسد کی تیز آگ ان کے تنگ دلوں میں پرورش پارہی تھی اور دل میں پیدا ہونے والے ہر اچھے جذبے کو اس آگ نے پھونک ڈالا تھا- "ابا ہم کو نہیں چاہتے' چھوٹے بھائی سے زیادہ پیار کرتے ہیں' اسی کو عزیز رکھتے ہیں- اس کو ختم کردو تاکہ باپ کا پیار و محبت ہمیں پھر سے حاصل ہوسکے-" یہ سب کی رائے تھی اور سب کا فیصلہ- اس فیصلے میں ایک ذرا سی ترمیم یہ ہوگئی کہ بجائے مارنے کے' باپ کے چہیتے اور چھوٹے بیٹے کو' کنویں میں پھینک دیا گیا-

ایک برائی دوسری کو جنم دیتی ہے- یہ برا کام کرنے والوں نے دوسرا برا کام یہ کیا کہ جھوٹ بولا اور وہ بھی باپ سے- مگرمچھ کے آنسو بہاتے ہوئے بولے- "ابا ہم کھیل میں لگ گئے تھے' بھیڑیا آیا اور یوسف کو کھا گیا-" جی ہاں یہ ان ہی یوسفؑ کے بچپن کی بات ہے جن کے واقعہ کو قرآن نے "بہترین قصہ" قرار دیا' جن کو حسن مثالی عطا کیا گیا اور جن کے فراق و جدائی میں ان کے باپ حضرت یعقوبؑ برسوں روتے رہے جس کے نتیجے میں آنکھیں رہیں مگر بینائی چلی گئی-

بیٹے کی جدائی کا درد و غم اپنی جگہ' آنسوؤں کا بہنا ایک فطری رد عمل' مگر صبر کو انہوں نے ہاتھ سے نہ جانے دیا- معاملے کو اللہ پر چھوڑا اور صبر اختیار کیا- اور صبر تو خود کنویں میں ڈالے جانے والے بیٹے حضرت یوسفؑ نے بھی کچھ کم نہیں کیا- کنویں میں ڈالے گئے تو کوئی آہ و فریاد نہیں- کنویں سے راہ جاتے قافلے نے نکال لیا تو کوئی داستان و حکایت نہیں اور جب مصر کے بھرے بازار میں کوڑیوں کے مول بیچ دیئے گئے تو کوئی شکوہ و شکایت نہیں مگر آزمائش کا دور یہیں پر ختم نہیں ہوا- اس بچے کو عزیز مصر نے خریدا اور پھر وہ اس کے محل سے جیل پہنچ گئے- انہوں نے گناہگار بننے کی بجائے قید ہونا پسند کرلیا- صلہ قدرت نے یہ دیا کہ جس ملک کے بازار میں بیچے گئے اور جس دیس کے قید خانے میں ڈالے گئے' وہیں کا حکمران بنادیا- اللہ اکبر-

ایک بنیادی چیز جس کا ذکر قرآن پاک نے کچھ اس طرح کیا کہ "جب وہ (یوسفؑ) بڑے ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے حکمت و علم سے نوازا اور نیکوکاروں کی یہی جزا ہے-" معلوم ہوا کہ (الف) علم و حکمت رب کائنات کی طرف سے جزا و انعام ہے- (ب) اسی سے صبر و ہمت اور عزم و استقامت کے دروازے کھلتے ہیں- (ج) اور یہی ایک اجنبی دیس میں ماں باپ سے چھوٹے ہوئے' دنیاوی سہاروں سے بے نیاز ایک بچے کو جیل کی دیواروں سے نکال کر تختِ شاہی پر بٹھانے کا ذریعہ بنتا ہے- اب ایک آخری بات یہ ضرور یاد رکھنا چاہیے کہ اس "حکمت و علم" میں علم بغیر حکمت کے تو آسکتا ہے لیکن حکمت بغیر علم کے نہیں آتی-

NUT CHOCOLATE
Milk Chocolate with Nuts
HACKS DROPS
HERO
HACKS
mentholated drops.
ORANGE CANDIES
real orange taste.
HERO
creamy milk chocolate
with rich coconut filling.
NUT CHOCOLATE
milk chocolate
full of nuts.
MOVE TO PAXY'S GALAXY OF SWEET STARS
Paxy's
SIND CHOCOLATE WORKS
Plot No. 11, K-28(C), University Road, Karachi-74800, Pakistan.

لذّت، فرحت، چاہت بھی، رنگت، ٹھنڈک، خوشبو بھی
قومی مشروب
نورس
نورس
احمد فوڈ انڈسٹریز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
ڈی-112 ، نورس روڈ ، سائٹ، کراچی-75700 فون ، 2563520 (5 لائنیں)، فیکس، 2564570-21-92